ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

جنوری رفروری ۲۰۱۶ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نوٹ: بعض ادارتی مجبوریوں کے سبب جنوری فروری دو مہینوں کا شمارہ صفحات کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	فضول خرچی سے اجتناب کیجئے	محمد عارف ندوی
۲۔	اداریہ	سیرت نبوی کا انقلابی پیغام	مدیر ۳
۳۔	پیام سیرت	میں خواہش نفس نہیں۔فرمائش جاناں کا غلام ہوں	محمد فرید حبیب ندوی ۱۲
۴۔	// //	محبت رسولؐ اور اس کے تقاضے	محمد قمر الزماں ندوی ۱۵
۵۔	// //	قضیہ فلسطین اور ہماری ذمہ داری	تحریر: امام حسن البناء، ترجمہ: محمد الغزالی الندوی ۱۹
۶۔	شاہ راہ عمل	روشن مستقبل کی شاہراہ	پروفیسر محسن عثمانی ندوی ۲۱
۷۔	بحث وتحقیق	سلام اور جواب سلام میں.....ایک تحقیقی بحث	محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی ۲۴
۸۔	فقہی مباحث	غذا کے احکام اور علاج کی شرعی مصلحتیں	تحریر: مولانا عبدالباسط ندوی، ترجمہ: ڈاکٹر اشرف علی ندوی ۲۹
۹۔	اسلامی تعلیمات	عبادت کا قرآنی تصور اور مسلم قوم کا طرز عمل	محمد انس فلاحی سنبھلی ۳۴
۱۰۔	// //	والدین اور موجودہ سماج	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی ۴۱
۱۱۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۲)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۴۸
۱۲۔	گوشۂ غیاث	تأثرات وپیغامات (بروفات ڈاکٹر محمد غیاث صدیقیؒ)	۵۳
۱۳۔	زبان وادب	خودنوشت سوانح عمریوں میں ''آپ بیتی'' دریابادی.....	محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی ۶۳
۱۴۔	تجزیہ	میدان عمل میں قدم اٹھانے کی ضرورت.....	ابوطلحہ ندوی مظاہری ۷۵
۱۵۔	قضیہ فلسطین	انتفاضہ القدس	فہیم الامین ۷۷
۱۶۔	ذکر رفتگاں	ڈاکٹر محمد علی الہاشمی-ایک تعارف	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۷۹
۱۷۔	// //	پروفیسر سلمان بیگ بھی رخصت ہوگئے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۸۳
۱۸۔	تعلیمی خبریں	عالمی تنظیم فارغین ندوہ کی طرف سے.....	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۸۵
۱۹۔	تعارف وتبصرہ	اصلاح معاشرہ کی تعبیر	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۸۷
۲۰۔		فہرست مقالات عالمی کانفرنس (مفکر اسلامؒ)	ادارہ ۸۸
۲۱۔	آخری صفحہ	میں اللہ کو کیا جواب دوں گا۔	م۔ق۔ن۔ ۹۵

❋❋❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

سیرت نبوی کا انقلابی پیغام

ربیع الاول کی آمد سے دل و دماغ میں ہلچل پیدا ہو تو تعجب کیوں؟ اس مہینہ میں (۱) ہی تو وہ آفتاب ہدایت طلوع ہوا تھا جس کی روشنی سے دنیا منور ہوئی تھی، وہ ابر رحمت سایہ فگن ہوا تھا جس کے آغوش میں سسکتی ہوئی انسانیت نے پناہ لی تھی، برسہا برس سے یہ زمین پیاسی تھی بلکہ بنجر ہو چکی تھی، اسی ماہ میں تو اس ابر کرم کا ورود مسعود ہوا جس کے انوار کی بارش سے انسانیت باغ باغ ہوگئی، ظلم و جور کی بساط لپیٹ دی گئی، خالق ومخلوق کے درمیان سے پردے اٹھا دیے گئے، ایک نئی تہذیب، نئے تمدن کی بنیاد ڈالی گئی، تحریک دعوت کو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اس طرح متعارف کرایا گیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جزیرۃ العرب شرک و بت پرستی سے پاک ہوگیا، بلکہ بہت جلد آنحضرت کی حیات طیبہ میں ہی مسلمانان عرب جزیرۃ العرب سے نکل کر تبوک میں رومیوں کی منظم فوج (Professional Army) سے ٹکرا گئے اور اس طرح دعوت اسلامی کی شعائیں دور تک پھیلتی چلی گئیں، تاریخ اسلامی میں بڑی اہمیت ہے، اس غزوہ نبوی کی سورہ توبہ میں اس کا بڑے اہتمام وتفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہی وہ مہینہ تو تھا جس میں رحمۃ للعلمین کا

> .....یہی وہ مہینہ تو تھا جس میں رحمۃ للعلمین کا ظہور قدسی ہوا، اسی ظہور کے باعث وہ معصوم کلیاں مسکرانے لگیں، جو کھلنے سے پہلے مسل دی جاتی تھیں، یتیموں اور بیواؤں کے کپکپاتے ہونٹ مسکراہٹ سے آشنا ہوئے، جزیرۃ العرب کا ذرہ ذرہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا، کفر پر لرزہ طاری ہوگیا، قیصر وکسریٰ کے محلوں کے کنگورے ہلنے لگے، ایسا کیوں نہ ہوتا کہ تاجدار عالم، دستگیر بے نوا، امام بزم انبیاء سید والانسب خاتم الرسل حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تھی، آپ نے مضمحل دلوں کو تازگی بخشی، بیمار دماغوں کو نسخۂ شفا دیا، پژمردہ انسانیت کو زندگی کی نوید سنائی، کبر ونخوت کو پیروں تلے رگڑ دیا، بزم حیات کے منتشر نظام کو یکسوئی عطا کی، دنیا کو حریت کے معانی سمجھائے، اخوت و مساوات کا ایسا چلن ہوا کہ غلامی کی فضا کانپ اٹھی، سرکار دو عالم کی آمد سے مظلوموں کی آہیں اور ستم رسیدوں کے نالے نغمۂ طرب میں بدل گئے، دنیا جمہوریت کے اصولوں سے واقف ہوئی، مختصر یہ کہ آپ کی بعثت سے جھوٹے خداؤں کا فریب مٹنے لگا اور ظالم وجابر کفار کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا، آج بھی دنیا کو پھر اسی نبی امی کی سیرت کے ان جلووں کی ضرورت ہے جن کی جہاں آرائی وجہاں بانی، کرم فرمائی وغمگساری، مسیحائی و عدل پروری محقق ومدلل اور حقیقت مجسم ہے۔

ظہور قدسی ہوا، اسی ظہور کے باعث وہ معصوم کلیاں مسکرانے لگیں، جو کھلنے سے پہلے مسل دی جاتی تھیں، یتیموں اور بیواؤں کے کپکپاتے ہونٹ مسکراہٹ سے آشنا ہوئے، جزیرۃ العرب کا ذرہ ذرہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا، کفر پر لرزہ طاری ہوگیا، قیصر وکسریٰ کے محلوں کے کنگورے ہلنے لگے، ایسا کیوں نہ ہوتا کہ تاجدار عالم، دستگیر بے نوا، امام بزم انبیاء سید والانسب خاتم الرسل حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تھی، آپ نے مضمحل

(۱) اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت بروز دوشنبہ ماہ ربیع الاول میں ہوئی، مشہور یہی ہے کہ آپ کی ولادت ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی، مصر کے ایک عالم محمود پاشا فلکی نے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی روشنی میں تاریخ ولادت ۹ ربیع الاول قرار پائی ہے، مضبوط فلکی دلائل کی بنا پر اس کو راجح قرار دیا جا سکتا ہے، اسی طرح تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے، اتنا متفق علیہ ہے کہ دن دوشنبہ اور مہینہ ربیع الاول تھا، روایات یکم، دوم اور بارہ ربیع الاول کی ہیں، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک علمی بحث کے بعد یکم ربیع الاول کو راجح قرار دیا ہے، البتہ فلکی حساب سے نہ دیکھنے کے سبب یہ فرمایا ہے کہ اس پر فلکی حساب سے اندیشہ ہو سکتا ہے، کیا بعید کہ حق تعالیٰ نے ان خرافات کرنے والوں کو اندھیرے میں رکھا ہو جو جشن ولادت کے نام پر سیرت رسول اور تعلیمات نبوی کا مذاق بناتے ہیں، دیکھیے اس مرتبہ کرسمس اور بارہ ربیع الاول ایک ہی دن واقع ہوئے تو کوئی فرق نہ رہ گیا نصاریٰ اور محمد ﷺ کے نام لیواؤں میں، ان مسلمانوں نے نصاریٰ کی طرح وہ سب کیا جس سے ان کے نبیؐ نے منع فرمایا تھا۔

دلوں کو تازگی بخشی، بیمار دماغوں کو نسخۂ شفا دیا، پژمردہ انسانیت کو زندگی کی نوید سنائی، کبر ونخوت کو پیروں تلے رگڑ دیا، بزم حیات کے منتشر نظام کو یکسوئی عطا کی، دنیا کو حریت کے معانی سمجھائے، اخوت ومساوات کا ایسا چلن ہوا کہ غلامی کی فضا کانپ اٹھی، سرکار دوعالم کی آمد سے مظلوموں کی آہیں اور ستم رسیدوں کے نالے نغمۂ طرب میں بدل گئے، دنیا جمہوریت کے اصولوں سے واقف ہوئی، مختصر یہ کہ آپ کی بعثت سے جھوٹے خداؤں کا فریب مٹنے لگا اور ظالم وجابر کفار کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا، آج بھی دنیا کو پھر اسی نبی امی کی سیرت کے ان جلووں کی ضرورت ہے جن کی جہاں آرائی وجہاں بانی، کرم فرمائی وغمگساری، مسیحائی وعدل پروری محقق ومدلل اور حقیقت مجسم ہے۔

ربیع الاول آتا ہے اور چلا جاتا ہے، سیرت کے جلسے ہوتے ہیں، میلاد کی محفلیں سجتی ہیں، واقعات سیرت سنے اور سنائے جاتے ہیں، مضامین لکھے اور پڑھے جاتے ہیں، لیکن کیا قدم پر ہم سیرت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، ہم نے رسول ﷺ کے آفاقی وانسانی وعالمی پیغام حیثیت سے آپ نے خود اپنا تعارف کرایا تھا، کیا اور علمی زندگی سے دنیا بھر کے انسانوں کو آشنا سیرت کو اس حیثیت سے پڑھا کہ وہ معلم بھی تھے سیاستداں بھی تھے اور عبادت گزار بھی، عرب وعجم شکر گذار بندہ بن جانے کی تلقین بھی کرتے، فاتح اور خدمت کا سلیقہ بھی سکھایا، ہمارے طرز عمل سے والسلام کتابوں میں محفوظ رکھنے کے لئے ہے، نبوی پڑھنے اور سننے کے لئے ہیں، بیع وشراء کے کرنے کے لئے ہیں، کیا ایسا نہیں کہ ہم سیرت کے بعض حصوں کو پیش کرتے ہیں اور اکثر حصوں سے آنکھیں چراتے ہیں، سیرت کے دفتر کے دفتر ہضم کرنے والے ہی بتا سکتے ہیں کہ معلم اخلاق اور محسن انسانیت کے اسوۂ کامل کا کتنا عکس ہماری زندگیوں پر ہے اور کس قدر ہم نے ان کی تعلیمات کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنایا ہے اور عالم انسانیت کو ان کے احسانات سے متعارف کرایا ہے۔

سیرت کے دفتر کے دفتر ہضم کرنے والے ہی بتا سکتے ہیں کہ معلم اخلاق اور محسن انسانیت کے اسوۂ کامل کا کتنا عکس ہماری زندگیوں پر ہے اور کس قدر ہم نے ان کی تعلیمات کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنایا ہے اور عالم انسانیت کو ان کے احسانات سے متعارف کرایا ہے۔

نقوش سیرت ہماری آنکھوں میں ہیں، کیا قدم قدم ہم نے سیرت کے پیغام کو عام کیا ہے، کیا کو اس حیثیت سے متعارف کرایا ہے جس ہم نے آپ کی خانگی، معاشرتی، اجتماعی، سیاسی ہونے کا موقع دیا، کیا ہم نے حضور پاک کی اور امام بھی، قاضی بھی تھے اور حاکم بھی، کے مالک ہونے کی بشارت بھی دیتے تھے لیکن عالم بھی تھے مگر سراپا رحمت بھی، قیادت بھی کی ایسا لگتا ہے کہ سیرت رسول علی صاحبہا الصلوۃ شمائل نبوی شروحات لکھنے کے لیے ہیں، اخلاق احکامات امتحان پاس کرنے اور نظریاتی بحثیں

جس وقت آنحضرت کی بعثت ہوئی دنیا اس وقت ظلمت کدہ بنی ہوئی تھی، تہذیب وتمدن عنقاء تھا، جو اپنے کو متمدن سمجھتے تھے ان کا تمدن درندہ صفت تھا، یاجوج ماجوج کی طرح وہ ظلم وجور کے رسیا تھے، ظلم کی آخری انتہا یہ تھی کہ جزیرۃ العرب میں بچیاں زندہ درگور کردی جاتی تھیں، پوری انسانیت ضلالت وگمراہی کی انتہا کو پہنچ چکی تھی بلکہ یوں کہیے کہ بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہوئی تھی قرآن پاک نے جو نقشہ کھینچا ہے اور جو تصویر کشی کی ہے اس سے زیادہ بلیغ اور مختصر وجامع تصویر کشی کس کے بس کی بات ہے؟ ظلم وجور کی تہذیب، کبر ونخوت وانانیت کی تہذیب، بے حیائی وفحاشی کی تہذیب، عورتوں کو جانور سے بدتر سمجھنے والی تہذیب، سیاسی انارکی سے عبارت تہذیب، جنگ وجدال سے سسکتی تہذیب، جوا وشراب اور معاشی استحصال والی تہذیب، اخلاقی وفکری دیوالیہ پن پر مشتمل تہذیب، ادنی درجہ کی انسانی اقدار سے بھی خالی تہذیب اور ایسی تہذیب جو عرب وعجم اور متمدن وغیر متمدن اقوام وقبائل اور دنیا کے سب خطوں پر چھائی ہوئی تھی، اس کا نقشہ کھینچنا اور اس اختصار سے کھینچنا بس قرآن کا اعجاز ہے، واذکرو نعمة الله عليكم إذ كنتم أعداءً فألف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته اخوانا وكنتم على شفا حفرة من النار فأنقذكم منها (آل عمران ۱۰۳) (ترجمہ: اور تم اللہ نے جو انعامات فرمائے انہیں یاد رکھو، کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کردی اور اس احسان سے تم بھائی بھائی ہوگئے، اور تم

دوزخ کے گڑھے کے کنارے تھے اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔)

انسانیت آگ کے گڑھے میں گرنا چاہتی تھی تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی تھی لیکن رسالت مآب تشریف لے آئے اور اسے گڑھے کے کنارے سے کھینچ لائے، خود ہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ گویا تم آگ میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں اس میں گرنے سے بچاتا ہوں۔

ان حالات میں آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا گیا۔ خفیہ طریقہ سے دعوت اسلامی کی تحریک کا آغاز ہوا، وانذر عشیرتك الأقربین (شعراء:۲۱۴) (ترجمہ: اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو خبردار کردو) سے تحریک شروع ہوئی، پھر فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین (سورہ حجر:۹۴) (ترجمہ: اب تمہیں جو حکم دیا جارہا ہے اس کو ببانگ دہل بیان کرو اور مشرکوں کی پروانہ کرو) کے ذریعہ توحید باری کا غلغلہ بلند کرنے کا حکم دے دیا گیا، آپ نے بھی جدوجہد شروع کردی، حبشہ کو ہجرت ہوئی، وطن عزیز خود آنحضرت کو چھوڑنا پڑا، مکہ سے رخصت ہوئے، اس حال میں رخصت ہوئے کہ دشمن پیچھا کر رہا تھا، مدینہ کو وطن بنایا، یہی پہلی اسلامی ریاست کا مرکز بنا، پھر بے سروسامانی کے عالم میں بدر کی جنگ پیش آئی، معاہدے کیے گئے، خطوط لکھے گئے، وفود بھیجے گئے، تگ ودو جاری رہی، جاں نثاروں کی جاں نثاری تاریخ کا حصہ بنتی رہی، اسلامی سلطنت کی حدود وسیع ہوتی رہیں، لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے اذا جاء نصر الله والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین الله افواجا (سورہ نصر:۲) (ترجمہ: جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے گی، اور آپ دیکھ لیں گے کہ لوگ جوق در جوق اللہ کی دین میں داخل ہورہے ہیں) کے ذریعہ قرآن نے اس سماں کی منظر کشی کی ہے، مکہ مکرمہ فتح ہوگیا، بشیر ونذیر کی زبان حق ترجمان سے نکلی ہوئی پیش گوئیاں ان لوگوں نے بچشم خود دیکھ لیں جو کل تک خیمہ کفر میں بیٹھ کر استہزاء کیا کرتے تھے، حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت کے ساتھ ایک لاکھ سے زائد جاں نثاروں کا مجمع تھا، یہیں تکمیل دین کا یہ قطعی وحتمی اعلان کردیا گیا، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتي ورضیت لکم الإسلام دینا۔ (سورہ مائدہ:۳) (ترجمہ: آج میں نے تمہاری خاطر تمہارا دین مکمل کردیا، اور اپنے انعامات (ایک واضح قانون دے کر) تم پر تمام کردئے ہیں۔)

آج جاہلیت عود کر آئی ہے، ''جاہلیت اولیٰ'' جو قرآن کی تعبیر ہے اس کے بعد آج پھر جب جاہلیت کا دوسرا دور شروع ہوگیا ہے تو اسے جاہلیت ثانیہ سے تعبیر کرنے میں حرج کیا، جاہلیت کے تمام مظاہر بڑی اپ ڈیٹ اور متمدن صورت میں ہمارے سامنے ہیں، تو پھر کیا اس کی ضرورت نہیں کہ سیرت کے عملی نمونے پیش کیے جائیں، سیرت کی روشنی سے تہذیب جدید کی ظلمتوں کو خیرہ کیا جائے اور کیا یہ ممکن نہیں کہ امت کا ہر ہر فرد سیرت کا عکس لے کر عملا مسلمان بن جائے اور دنیا کے سامنے اس رہبر کامل کے ابدی وکامل اسوہ کو یوں پیش کرے کہ ایک بار پھر دنیا تہذیب اسلامی کی آغوش میں پناہ لے سکے۔

آج حالات اس وقت سے زیادہ سخت نہیں، وسائل اس دور سے کم نہیں، تعداد کا مسئلہ کبھی ہمارے عقیدے کا حصہ نہیں رہا اور قرآن نے تو یہ کہہ کر اس مسئلہ کو ہی ختم کردیا کہ کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة (سورہ بقرہ:۲۴۹) (ترجمہ: کتنے چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے بڑے گروہوں پر غالب آتے ہیں) اور یوں بشارت دے دی فإن حزب الله هم الغالبون (مائدہ:۵۶) اور اس طرح شرط نصرت وفتح واضح کردی ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الأعلون إن کنتم مؤمنین (آل عمران:۱۳۹) (ترجمہ: تم لوگ بزدل اور کمزور نہ پڑو، اور نہ رنج وغم کے شکار ہو، تم اگر مؤمن ہو تو تم ہی برتر ہو)۔

اس وقت مسلمانوں کی جو نفسیاتی حالت تھی، خوف وہراس کا جو ماحول تھا اور دعوت اسلامی کی ابتدا میں اسے جن مصائب ومشکلات کا سامنا تھا، قرآن سے زیادہ بلیغ انداز میں اس کا حال کون بیان کرسکتا ہے واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون أن یتخطفکم الناس فاواکم وایدکم بنصره ورزقکم من الطبیات لعلکم تشکرون (انفال:۲۶)

(ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑی تعداد میں تھے، ملک میں دبے کچلے تھے، تمہیں ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں لوگ تمہارا اغوا نہ کر لیں، پھر اللہ نے تمہیں محفوظ ٹھکانہ دیا اور اپنی نصرت سے تمہاری تائید کی، اور تم کو پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں، تاکہ تم شکر گزار رہو۔)

ہمیں لگتا ہے کہ آج ہی مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں، انہیں لقمۂ تر سمجھا جا رہا ہے، نبی اسلام اور تعلیمات اسلام کا مذاق بنایا جا رہا ہے، قرآن مجید نے کفار و منافقین کے کردار کھول کھول کر بیان کیے ہیں اور یہ واضح کر دیا ہے کہ دعوت اسلامی کا سورج ان ہی مشکلات سے طلوع ہوا ہے، اگر قرآن مجید سے فائدہ اٹھایا جائے اور سیرت نبوی کو اسوہ بنایا جائے تو یقیناً ان ہی نامساعد حالات کی کوکھ سے عروج و اقبال کا سورج طلوع ہوگا۔

دیکھنا یہ ہے کہ آج ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے، حضور ﷺ نے ابتدا میں بلا تفریق جو بھی حلقہ بگوش اسلام ہوا اس کی تربیت فرمائی اور اس طرح فرمائی کہ ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس کے رگ و پے میں اسلام سرایت کر گیا، جس کے دل کی دھڑکن اسلام بن گیا، جس کی رگوں میں خون بن کر اسلام دوڑنے لگا، جس کو مادیت اور مادیت کے مظاہر سے نفرت ہوگئی، جو نبی کے اشاروں پر مر مٹنے کے لئے تیار رہنے لگے، جو اعمال خیر میں منافست کرنے لگے، جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے میں لطف محسوس کرنے لگے، شہادت جن کا مقصود بن گئی، عبادت جن کی عادت بن گئی، اطاعت جن کی فطرت بن گئی، شرم و حیا جن کا زیور بن گیا، تعلیم و تعلم جن کا شیوہ ہو گیا، ایثار و قربانی جن کا وصف قرار پایا، آخر یہ کیوں کر ممکن ہوا، اسی لئے تو ہوا کہ رسول ان کے لئے تڑپتے تھے، ان کی فکر میں گھلتے تھے، ان کی تکلیف پر بلکتے تھے، ان کی بھلائی کے طالب تھے، ان کے ساتھ شفقت و محبت کا وہ معاملہ فرماتے کہ کوئی ماں بھی اس کا تصور نہ کر سکے، لقد جاءكم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم وحريص عليكم بالمؤمنين رؤوف رحيم (التوبہ: ۱۲۸) (ترجمہ: یقیناً تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہوا ہے اسے تمہاری مشقت اور دقت اور مصیبت بہت گراں گزرتی ہے، وہ تمہارے لیے بہت فکر مند اور ایمان والوں پر بہت شفیق و مہربان ہے) رحم و کرم، حسن سلوک، غمخواری و غم گساری اور عایا پروری، عدل و انصاف سے ان کو عملا روشناس کراتے، غلبہ و قدرت کے بعد بھی معافی کا انہیں درس دیتے، بے کسی و بے بسی میں عفو و درگزر چھوڑ یے، انہیں استاد بن کر سمجھایا، باپ بن کر دکھایا، شوہر کے فرائض سے روشناس کرایا، حالت امن و حالت جنگ میں صبر و سکون کے ساتھ اصول زندگی سے روشناس کرایا، عبادت و شکر گزاری کے جذبات سے آشنا کیا، تعلیم کے فضائل بتائے، ذکر و فکر کے نتائج سے آگاہ کیا تزکیہ و احسان کی اہمیت سے آگاہ کیا، تجارت کے اصول سکھائے، تفریق و تفرقہ کے نتائج بد سے متنبہ کیا، اتحاد و اتفاق کی طاقت سے آشنا کیا، ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی نہ صرف مسجد میں گزری اور نہ پوری کی پوری عبادت میں، اسی لئے آپ کی سیرت کو اس طرح پڑھنا چاہیے کہ دیکھا جائے آپ نے کن اوقات اور کن حالات میں کس طرح زندگی گزاری ہے، آپ گھر میں کس طرح پیش آئے، سیاسی مسائل کو کس طرح حل کیا، میدان جنگ میں کس طرح قیادت کی، ایمرجنسی کے حالات میں کس طرح رہنمائی کی، مشکل ترین حالات میں کس طرح کے اقدامات کیے، یہاں سکھانے والا بھی انذار کی صفت سے متصف تھا اور سیکھنے والے بھی حصول علم کا مقصد اور اس کی انتہا یہ سمجھتے تھے کہ ان کو دین کا فہم حاصل ہو جائے اور وہ اوامر کی پابندی کرنے والے اور منہیات سے بچنے والے بن جائیں، فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون، میں ليتفقهوا فی الدين اگر یہ بتاتا ہے کہ لفظ سے اس قدر فہم و بصیرت مطلوب ہے کہ اسلام کے مقتضیات سمجھ میں آنے لگیں، غیر مسلمانہ رویوں کی تمیز ہونے لگے، اس کا محض عامۃ الناس کو خواندہ بنانا ہرگز مقصد نہیں، اسی کے ساتھ انذار کا جو لفظ استعمال ہوا اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کا اصل مقصد دین کی بصیرت حاصل کرنا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اخروی زندگی کے لئے بیدار و تیار کرنا ہے، انذار کے معنی ہی ہیں ڈرانے ہوشیار کرنے اور بالخصوص آخرت کی تیاری کے لئے بیدار کرنے کے، انذار جب نبی کی

صفت بنتی ہے تو اس میں رحمت وشفقت اور لگن وتڑپ کے ساتھ متنبہ کرنے کے معنی پیدا ہوجاتے ہیں۔

کبھی آپ نے عبادت کی فضیلت بیان کی تو کبھی معاشرت کے اصول بتائے، کبھی آپ نے یہ فرمایا کہ میری بعثت ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے ہوئی ہے، کبھی فرمایا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے، چنانچہ آپ نے گھر کی اخلاقیات سے لے کر بازار کے آداب تک کی تعلیم دی، آخر وہ کون سا شعبہ زندگی ہے جس میں آپ کی عطر بیز سیرت رہنمائی نہیں کرتی، کبھی آپ کرتے اور کبھی دن میں جہاد کی تیاری کا کر لیتے، جنگی قیدی آپ کے حسن اخلاق سے حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے، خادموں سے پوچھیے تو آقا کی تعریف میں رطب اللسان ہوجائیں، ازواج مطہرات سے اندرون خانہ کا حال سنیے تو تاجدار عالم کے حسن اخلاق اور گھریلو زندگی میں ان کے بے نظیر لمحات ہر گھر کی تنویر کے لئے کافی، کیا خوب ارشاد عالی ہے آپ کا ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے سے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے سب سے بہتر ہوں''، زندگی جس حال میں ہو کسی ایک حال سے خالی نہ ہوگی اور ہر حال میں سیرت رسول کا نمونہ ہمارے سامنے ہوگا، آپ نے فرط مسرت کے لمحات بھی دیکھے، غموں سے نڈھال بھی ہوئے، طائف میں آپ کو گالیاں بھی دی گئیں اور وطن عزیز سے آپ کو نکالا بھی گیا، آپ پر طعنے بھی کسے گئے اور برا بھلا بھی کہا گیا، آپ فتوحات کی لذت سے بھی شاد کام ہوئے اور شکست کے درد کو بھی جھیلنا پڑا، آپ کو فرط عقیدت سے مرمٹنے والے جاں نثار بھی ملے اور خون کے پیاسے دشمنوں سے بھی سامنا ہوا، آپ کے لیے پلکیں بھی بچھائی گئیں اور آپ ہی کے لیے سازشیں بھی رچی گئیں، آپ کی سیرت میں عفو ودرگزر کا نمونہ بھی ہے اور تنبیہ وسزا کی مثال بھی، مصالحت، اقدام اور دفاع کے جس حال میں ہم ہوں آپ کی بے مثال سیرت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

یہ رسالت مآب ﷺ (فدہ ابی وامی) کا ہی اعجاز تھا کہ انھوں نے ان سارے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر صحابہ کرام کی ایسی تربیت فرمائی کہ قرآن اگر آپ کی سیرت واخلاق تھا تو صحابہ قرآن کی تفسیر بن گئے بلکہ اس کی تصویر مجسم ہوگئے، پھر وہ جدھر گئے کھلے ہوئے مصحف کی طرح پڑھے گئے، ان کے تقدس وعظمت پر لوگ نثار ہوگئے، ان کی پاکیزگی وپاکبازی اور استغناء وزہد، رواداری ومروت اور اخوت ومحبت نے دلوں کو فتح کیا، دعوتی مشن اور اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا رہنے کے ساتھ انہوں نے ایمانی طاقت وقوت اور ان کے اندر موجزن اسلام کی شان وشوکت کے سبب ولیجدوا فیکم غلظة (توبہ:۱۲۳) (ترجمہ: اور وہ تمہارا سخت موقف محسوس کریں) کی ہدایت بھی ہمیشہ ملحوظ رکھی۔

یہ رسالت مآب ﷺ (فدہ ابی وامی) کا ہی اعجاز تھا کہ انہوں نے ان سارے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر صحابہ کرام کی ایسی تربیت فرمائی کہ قرآن اگر آپ کی سیرت واخلاق تھا تو صحابہ قرآن کی تفسیر بن گئے بلکہ اس کی تصویر مجسم ہوگئے، پھر وہ جدھر گئے کھلے ہوئے مصحف کی طرح پڑھے گئے، ان کے تقدس وعظمت پر لوگ نثار ہوگئے، ان کی پاکیزگی وپاکبازی اور استغناء وزہد، رواداری ومروت اور اخوت ومحبت نے دلوں کو فتح کیا، دعوتی مشن اور اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا رہنے کے ساتھ انہوں نے ایمانی طاقت وقوت اور ان کے اندر موجزن اسلام کی شان وشوکت کے سبب ولیجدوا فیکم غلظة (توبہ:۱۲۳) (ترجمہ: اور وہ تمہارا سخت موقف محسوس کریں) کی ہدایت بھی ہمیشہ ملحوظ رکھی۔

یہ سب کچھ اسی لیے ہوا کہ آقا مدنی ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کی، آپ کو جو فرائض منصبی دیے گئے ان کی آپ نے مکمل اور بلاتفریق ادائیگی کی، ذرا ہم آپ کے فرائض منصبی بیان کرنے والی اس آیت پر غور کریں اور اپنے کھوکھلے پن پر نظر ڈالیں **هو الذی بعث فی الأمیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وإن کانوا من قبل لفی ضلال مبین.** (سورہ جمعہ:۲) (ترجمہ: وہی ہے جس نے اسی قوم (ان پڑھ قوم) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرمایا، جو ان کے سامنے اللہ کے کلام

کی آیتیں پڑھ کر سنا رہا ہے۔ اوران کا تزکیہ فرما رہا ہے (ان کی عادتوں، اخلاق اور ظاہر و باطن کو سنوار رہا ہے) اور انہیں الکتاب (قرآن مجید) کا علم دے رہا ہے، اور حکمت (دانشمندی، تہذیب وسلیقہ مندی) کی باتیں سکھا رہا ہے، اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔)

آج ہم نظریات کی تبلیغ میں لگ گئے، مکاتب فکر کی توسیع سے تسکین حاصل کرنے لگے، شخصی حلقوں کو بڑھانے کی فکر میں پڑ گئے، دعوت اسلامی کے پس پردہ مقصود نظریہ اور طریقہ کی تبلیغ ہوتی ہے، مسلمان بنانے کی کسے فکر، اخلاق سنوارنے کی کس کو چاہت، ملت کی زبوں حالی پر تڑپنا کسے نصیب، دوسرے کے درد پر تکلیف محسوس کرنا کہاں ہمارا مقدر، یہی تو اوصاف ہیں جن کے وجود سے مسائل کا حل ممکن ہے، مسئلہ کسی جماعت، کسی گروہ اور کسی ملک کا نہیں، مسئلہ پوری ملت اسلامیہ کا ہے، آج پوری ملت تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ایمان وعقیدے کی پختگی اور اعتماد ویقین کی اس بلندی کو اپنا شعار بنایا جائے جس کی تلقین حضرت محمدؐ نے سیدنا صدیق کو اس وقت کی تھی جب دشمن سر پر کھڑا تھا اور لا تحزن إن الله معنا (توبہ:۴۵) (ترجمہ: غم مت کر یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے) پر اعتماد کی تلقین کی تھی، پھر اس اعتماد کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا جائے اور ساری نظریاتی بحثیں ختم کر کے اور تفریق کے بتوں کو توڑ کر سیرت کے جامع وکامل اسوۂ حسنہ سے انسانیت کو علمی وعملی بہر دو اعتبار متعارف کرایا جائے۔

سیرت رسول کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ جو دین لے کر آئے تھے وہ برپا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ ہر فرد پر اس کی حکمرانی ہو، ہر عقل اسی کے تابع ہو، معاشرہ اپنی اجتماعی زندگی میں اسی سے رہنمائی حاصل کرے، آپ نے زندگی کا رخ یکسر بدل دینے میں کامیابی ہی اسی لیے حاصل کی کہ آپ نے یا أيها الرسول بلغ مما انزل إليك (مائدہ:۶۷) (ترجمہ: اے پیغمبر آپ کی طرف پروردگار کے پاس سے جو نازل کیا گیا ہے، اسے لوگوں تک پہونچا دیجئے) پر عمل کر کے دکھایا، صحابہ نے اس طرح آپ کی سیرت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ دین پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لئے ہی آیا ہے، لیکن مقام افسوس ہے کہ آج ہم دین کا جو تصور لیے ہوئے ہیں اس میں کہیں سے کہیں تک سیرت کا وہ پرتو نظر نہیں آتا، بلاد عربیہ مغرب کے در پر خندہ زن ہیں اور برصغیر قدیم وجدید، خانقاہ ومدرسہ اور تحریک وتبلیغ کی نظریاتی الجھنوں کا شکار، محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ دین آفاقی عبادات میں محدود ہو کر رہ گیا ہے، عقل مغربی فلسفہ سے وابستہ ہے تو دل مغرب کے تہذیب وتمدن پر فریفتہ، دین وسیاست میں کلیسائی تقسیم ہے، علم کی تفریق سے ہماری رسوائی وجگ ہنسائی ہمارا مقدر بن گئی ہے اور نظام تعلیم پر مغرب کی حکمرانی نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے، اخلاقی حالت ایسی گئی گزری کہ عدالتیں مسلمانوں کے آپسی تنازعات سے پٹی پڑی ہیں، طرفہ یہ کہ اسوۂ کاملہ ہمارے پاس موجود ہے اور فائدہ اس سے دوسروں نے اٹھایا ہے، اسرار کائنات سے پردے ہماری کتاب مقدس نے اٹھائے ہیں لیکن ہم صرف اس سے برکت حاصل کرنے تک محدود ہو کر رہ گئے اور اغیار نے اس کے اصول تسخیر پڑھ کر دنیا مسخر کر لی۔

سچ یہ ہے کہ ہمیں سیرت کے پیغام کو سمجھنا پڑے گا اور اپنے ماضی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، صحابہ کرام ہر ہر قدم پر سیرت رسول کے نمونوں سے رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے، جب جب لوگوں نے اس سے رہنمائی حاصل کی تب تب غلبۂ دین کی بشارت پوری ہوتی نظر آئی، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ لا تحزن إن الله معنا (توبہ:۴۰) ترجمہ: غم مت کر یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے) کی کیفیت سے سرشار ہوا جائے، دعوتی تحریک کو تیز تر کیا جائے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو پورے خلوص کے ساتھ انجام دیا جائے، انی رسول الله الیکم جمیعا (اعراف:۱۵۸) (ترجمہ: میں تم سب کا رسول ہوں) کی صدائے بازگشت دنیا کو سنائی جائے، لیکون للعالمین نذیرا کی حقیقت سے دنیا کو روشناس کرادیا جائے، وما ارسلنٰك الا كافة للناس بشيرا للناس بشيرا ونذيرا پر عمل کر کے اتمام حجت کی جائے۔ وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمين (انبیاء:۱۰۷) (ترجمہ: اور ہم نے آپ کو تمام طبقات کے لئے رحمت بنایا ہے) کے پیام امن ورحمت کو عام کیا جائے، إني وجهت وجهي للذي فطر السمٰوٰت والارض حنيفا وما

أنا من المشركين۔ (انعام:۷۹)(ترجمہ:میں تو اپنا رخ اس ذات کی طرف کرتا ہوں،جس نے عدم سے آسمانوں اور زمین کو وجود بخشا ء میں تو صرف اس کے لئے یکسو ہوں،اور میں شرک کرنے والا ہیں۔)قل إن صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین، لا شریك له وبذلك امرت وأنا اول المسلمین (سورہ انعام:۱۶۲-۱۶۳)(ترجمہ:اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ میری نماز، اور میری قربانی،اور میری زندگی،اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے،جو سب کا مالک و پروردگار ہے،اور جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم فرمایا گیا ہے،اور میں تمہارے درمیان پہلا مسلمان ہوں) کے راز کو سمجھا جائے اور خلوص ووفا کے ساتھ زندگی کو دین وملت کی خدمت میں لگایا جائے،اپنی نسبت صرف اللہ ورسول سے جوڑی جائے اور اسی کے فضل وعطا کو بہتر سمجھا جائے، وقت کے تقاضوں کے مطابق سیرت رسول سے رہنمائی حاصل کی جائے تو یہ ممکن نہیں کہ حالات کے تیور نہ بدلیں،فضا ہمارے موافق نہ ہو،بس شرط صرف اتنی ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے سارے بورڈ ہٹا دیے جائیں،سارے بینر توڑ دیے جائیں،تفریق اور بے سبب راجح ومرجوح کے جھگڑوں کو ختم کر کے تلاوت وتعلیم اور تزکیہ وحکمت کی جامعیت سے فائدہ اٹھایا جائے،مدرسہ واسکول کو اسی کی روشنی میں مفید بنایا جائے،تبلیغ ودعوت کے سارے طریقے استعمال کیے جائیں،تحریک دعوت کو کسی نظریہ اور کسی طریقہ کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس طریقہ،جس حربہ اور جس زبان سے کفار پر اثر ہو اور اہل اسلام کی اصلاح ہو ان سب کا استعمال کیا جائے،واعدوا لهم ما استطعتم من قوة (انفال:۶۰)(ترجمہ:اور ان کے مقابلہ کے لئے ہر ممکن طاقت تیار رکھو) کا یہی تو مطالبہ ہے،کہ جس علم سے،جس آلہ سے،جس اسلحہ سے،جس حربہ سے،جس طرح سے بھی ممکن ہو،وقت کا جو چلن ہو،زمانہ کا جو تقاضہ ہو اسے حاصل کیا جائے،یہ تب ہی ممکن ہے جب سیرت نبوی کے ابدی اسوہ سے رہبری حاصل کی جائے اور رہبر کامل کی ہدایات کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنایا جائے،ہر حال میں اسی ذات اقدس کو مقدم رکھا جائے، کیوں نہ ایسا ہوا کہ سیرت پر بیانات کرنے والے عملا ان ہدایات سے فائدہ اٹھاتے،اپنے نصاب ونظام میں تبدیلیاں کرتے،ترقی اور تعمیر کے لئے ماضی قریب نہیں ماضی بعید کی طرف لوٹنا اشد ضروری ہے،طالبان علوم نبوت کیا نہیں کر سکتے اور کیوں نہیں کر سکتے،اگر حکومت کا قیام مشکل اور غلبۂ اسلام ہمارے بس کی بات نہیں،تو کیا اس کی تمنا اور اسلامی نظام کے دوسرے اجزاء کے نفاذ میں بھی ہم مجبور ہیں، کتاب التجارہ کی نبوی ہدایات ہم پڑھیں اور پڑھائیں،مدینہ کے بازار کی تفصیلات کتب سیرت سے نقل کریں اور غیر سودی تجارت اور اسلامی بینکنگ کے راگ اغیار الاپیں،وقت کے مطابق فیصلے کرنا اور سیرت سے استنباط کرنا ہی تو مـــا ستـطعهم من قوة کا مطالبہ اور مومنانہ فراست کی دلیل ہے،ہر وہ کام مطلوب ومقصود ہے جس سے اسلام کو تقویت پہنچے اور جس کے ذریعہ دین کی حفاظت واشاعت کا سامان بہم ہو،سیرت نبوی اسی کی طرف تو رہنمائی کرتی ہے اور صحابہ کرام کا یہی تو طرز عمل رہا ہے، ہمارے تخلف کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے سیرت کو محض واقعات نگاری تک محدود کر دیا اور اسے تقدس کی نظر سے پڑھنے اور برکت حاصل کرنے تک محدود ہو گئے۔

اس یک نکاتی پروگرام کو اپنی زندگیوں،تنظیموں اور جماعتوں واداروں کا لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے،جس کا اظہار داعی اسلام،محسن انسانیت،شہنشاہ کونین نے چچا ابو طالب کو جواب دیتے ہوئے کیا تھا،فرمایا تھا:''چچا! خدا کی قسم اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں اس کو چھوڑ دوں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو غالب کرے یا میں اس راستہ میں کام آجاؤں،تب بھی میں اس سے باز نہ آؤں گا''صحابہ کرام نے اسی یک نکاتی پروگرام کو اپنے لئے حرز جاں سمجھا اور خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ نے سب سے پہلے اس پر عمل کرتے ہوئے

مرتدین کے معاملہ میں اختلاف رائے کے موقع پر یہ تاریخ ساز جملہ ارشاد فرمایا: ''أینقص الدین وأنا حی''، لیکن صد افسوس آج امت محمد کے پاس سب کچھ ہے، نہیں ہے! تو بس یہ جذبہ نہیں ہے، اس انقلابی پروگرام پر نظر نہیں ہے، نبی کی محبت میں تڑپنا، شان رسالت میں توہین پر بزم آب وگل کو تہس نہس کر دینا زندگی کی علامت بھی ہے اور ایمان کی رمق باقی ہونے کی دلیل بھی۔ لیکن کیا یہ نبوت کے پیغام اور رسول کی رسالت کے ساتھ عقیدت کے پھول نچھاور کرنے والوں کا بھدا مذاق نہیں کہ ان کی زندگی پوری کی پوری سنت وسیرت سے دور ہوگئی، مقصد حیات تہذیب جدید کی ظلمتوں میں گم ہوکر رہ گیا، فکر آخرت مادیت کے اندھیروں میں غائب ہوگئی، نہ ایمان کی گرمی رہی نہ تنظیم امت کا شعور، صنم خانوں کا وجود مٹ گیا مگر افراد ملت نے اتنے بت تراش لیے کہ آزری بھی ماتم کرنے لگی، انتشار کا ایسا دور شروع ہوا کہ محفل بغداد بھی ویران ہوگئی، حجازی لے بھی ناپید ہوگئی، نہ مصر وشام پہلے کی طرح باقی رہے نہ عرب کے ایوانوں میں پہلے سی رونق رہی ___ کیا صرف نعرۂ الفت سے اقبال مند ہوجانا ممکن ہے، مسلمانوں کے دور اقبال اور عہد عروج کا راز سیرت طیبہ سے عملی رہنمائی حاصل کرنے میں مضمر ہے، آج اگر ملت طالب ہے امامت وسیادت کی تو اسے سیرت رسول کو عملی زندگی کا حصہ بنانا ہوگا، صداقت وامانت کا سبق یاد کرنا ہوگا، عقبیٰ کی فکر کرنی ہوگی، دنیا کو سنوارنا ہوگا، قرآن سے رہنمائی حاصل کرنی ہوگی، دعوتی تحریک چھیڑنی ہوگی اور تلوار کو نیام میں رکھ کر ہر وقت سامنے رکھنا ہوگا، سیرت طیبہ کی جامعیت اگر پیش نظر نہ رہی تو عروج واقبال ایک خواب ہے، سراب ہے اور ایسا فسانہ ہے جو حقیقت سے بیگانہ ہے۔

دنیا نے اجالے اسی سیرت محمدی کے طفیل دیکھے ہیں کہ آپ کی بعثت سے پہلے کہاں تھے اجالے، پھر جب اسی سیرت کو اسوہ قرار دیا جائے گا اور صاحب سیرت ﷺ سے وفاداری کا مخلصانہ ثبوت دیا جائے گا تو سارا جہاں ہمارا ہوگا۔ نور سرمدی کے اسوہ ابدی کو پیش کرنے والی یہ سطریں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اقتباس پر ختم کی جاتی ہیں جو ان کے قلم کا اعجاز اور اس سلسلہ کا شاہکار ہے، جس میں سیرت نبوی کے اسوہ حسنہ وکاملہ کی بلیغ ومؤثر اور جامع ترین تشریح کی گئی ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالت انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔ اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی وبیکسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار ومدد گار نبیؐ کا اسوہ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم ونسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم

ونسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصریٰ کے داروان سالار کی مثالیں ڈھونڈو، اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو، جو حجر اسود کو ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو، جس کی نظر انصاف میں شاہ گدا اور امیر و غریب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسن حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی اور کسی حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لئے نمونہ اور تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لئے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لئے ہدایت کا چراغ اور راہنمائی کا نور محمد رسول اللہ ﷺ کی جامعیت کبریٰ کے خزانہ میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔

اس لئے طبقۂ انسانی کے ہر طالب اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لئے صرف محمد رسول اللہ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے، جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ کی سیرت ہے، اس کے سامنے نوح و ابراہیم ایوب و یونس اور عیسیٰ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں۔ گویا تمام انبیاءِ کرام کی سیرتیں صرف ایک ہی جنس کی اشیاء کی دوکانیں ہیں اور محمد رسول اللہ کی سیرت اخلاق و اعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار (مارکیٹ) ہے، جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شئے کے طلبگار کے لئے بہترین سامان موجود ہے۔ (خطبات مدراس، علامہ سید سلیمان ندویؒ ص ۷۴-۷۵)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

پیام سیرت

میں خواہش نفس نہیں۔فرمائش جاناں کا غلام ہوں

محمد فرید حبیب ندوی

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
آنکھوں سے درد صاف جھلک رہا تھا۔
احساس فراق اس کی پلکوں سے عیاں تھا۔
چہرہ پژمردہ تھا۔
وہ سراپا تصویر غم بنا ہوا تھا۔
درد فرقت اور احساس جدائی اس کے ایک ایک لفظ سے محسوس کیا جاسکتا تھا۔
وہ شہر کی سرحد پہ کھڑا اس کا آخری دیدار کر رہا تھا۔
اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ اس کی آخری زیارت ہے۔
ڈبڈباتی آنکھوں سے اس نے اپنے محبوب سے وصیت کی فرمائش کی۔
اس کے سامنے اس کی آنکھوں کا سرور، دل کا چین اور دماغ کا سکون حاضر تھا۔
وہ شخصیت اس کے سامنے موجود تھی جس کے رخ زیبا کا دیدار ایک بڑی عبادت تھی۔
نگاہیں اس کے چہرے پہ گڑا رکھی تھیں۔
شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جی بھر کر آج ہی دیکھ لیا جائے۔
زیارت کی پیاس وہ آج ہی بجھانا چاہتا تھا۔
کہ نہ معلوم پھر محبوب کے رخ انور کا دیدار ہو بھی سکے گا یا نہیں!!
اور یہ حال صرف اسی کا نہ تھا، اس کے آقا کا بھی یہی حال تھا۔

یہ صرف اسی کا امتحان نہ تھا، رخصت کرنے والے کا بھی امتحان تھا۔
اس کا محبوب بھی انہی جذبات سے بھرا تھا۔
آنکھیں تھیں کہ بہے جاتی تھیں۔
جذبات تھے کہ مجسم ہوا چاہتے تھے۔
اشارات تھے کہ الفاظ بننے کے خواہاں تھے۔
مگر یہ کب کسی کے بس میں تھا جو کہ اب ہوتا!!
استاد کے لئے محبوب شاگرد کی جدائی کتنی شاق ہوتی ہے!!
مرشد کے لئے مرید کا فراق کتنا درد انگیز ہوتا ہے!!
اسی طرح شاگرد کے لئے استاذ کو الوداع کہنا کتنا دل دوز اور جگر سوز ہوتا ہے!!
ان احساسات کو مادیت کے اس دور میں کیسے سمجھا جائے جب کہ استاذ و شاگرد کا تعلق محض رسمی ہو کر رہ گیا ہے۔
اگر کوئی دیکھ سکتا ہے تو ان احساسات و جذبات کو ماضی کے آئینہ میں دیکھے۔
بہر حال، وہ دونوں ایک دوسرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھے۔
سسکیاں آواز میں بدلتی ہیں۔
جذبات ''الفاظ'' کا قالب ڈھالتے ہیں۔
جانے والا وصیت کی فرمائش کرتا ہے اور رخصت کرنے والا اسے آخری نصیحتوں سے نوازتا ہے۔

یہ بات ہے حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضور اکرم ﷺ کی۔
آپ ﷺ حضرت معاذؓ کو دعوت وتبلیغ کے لئے یمن بھیج رہے تھے۔
لوگ سمجھتے ہیں کہ جان دینا سب سے زیادہ مشکل ہے، مگر مجھے لگتا ہے کہ ان صحابہ کے لئے:
اپنی جان نچھاور کر دینا آسان تھا۔
مال وملکیت کی قربانی سہل تھی۔
بیوی بچوں کو فراموش کر دینا بھی ہیچ تھا۔
ان کے لئے سب سے بڑی قربانی اور سب سے بڑی مشکل اور مصیبت یہ تھی کہ ان کی ''محبوب شخصیت'' ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔
وہ ذرا سی دیر کے لئے اس کی زیارت سے محروم ہو جائیں۔
آپ کو چھوڑ کر کہیں جانا۔
آپ سے جدا ہونا۔
آپ کا فراق۔
ان کے لئے ہر درد سے بڑا درد اور ہر غم سے بڑھ کر ایک غم تھا۔
اب اس جانے والے کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں:
محبوب کی جدائی یا اس کے حکم سے سرتابی۔
محبوب سے فراق یا اس کی حکم عدولی۔
محبوب کا درد فرقت یا اس کی نافرمانی کا غم۔
ایک کا تعلق اس کی ذاتی تکلیف سے تھا۔
جبکہ دوسرے سے اس کے محبوب کی دل شکنی ہوتی تھی۔
ایک سے صرف اس کے دل کو ٹھیس پہنچتی تھی۔
جبکہ دوسرے سے اس کے آقا کی دل آزاری ہوتی تھی۔
وہ اس بات کو تو پسند کر سکتا تھا کہ اس کا سارا بدن مجموعۂ درد بن جائے۔
وہ اسے بھی سہہ کر سکتا تھا کہ اس کے سارے جسم میں کانٹے چبھو دیے جائیں۔
مگر یہ سوچ کر اس کی قوت برداشت بھی جواب دے جاتی کہ اس کے محبوب کی آنکھ میں پھانس بھی لگے۔
یہ بات اس کے لئے ناقابل سہن تھی کہ اس کے جان جاناں کے دل کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچے۔
اسے وہ اپنے ایمان وکفر کا مسئلہ سمجھتا تھا۔
اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ دیار محبوب کو چھوڑ کر جائے۔
اس کی طبیعت ذرا بھی آمادہ نہیں تھی کہ محبوب کی گلیاں اس سے دور رہ جائیں۔
وہ کسی بھی طرح اس پر راضی نہیں تھا کہ اس کے محبوب کا پرنور چہرہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو۔
لیکن ایک طرف:
اس کی اپنی خواہشات تھیں۔
اس کے ذاتی جذبات تھے۔
اس کے اپنے ارمان تھے۔
اس کی اپنی چاہت تھی۔
اور دوسری طرف:
اس کے محبوب کا فرمان تھا۔
اس کے محبوب کی آرزو تھی۔
اس کے آقا کی فرمائش تھی۔
اس کے جان جاناں کا حکم تھا۔
اب سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنی خواہش کو اس کی خواہش پر ترجیح دے۔
اپنی چاہت کو اس کی چاہت پر فوقیت دے۔
چنانچہ اس نے:
اپنے جذبات کو کچلا۔
اپنی خواہش کو دبایا۔

اوراس عظیم مشن کے لئے جانے پر تیار ہوا جس کے لئے اس کے محبوب کی بعثت ہوئی تھی۔

اس واقعہ میں ہمارے لئے بڑا سبق موجود ہے۔

دین کی تعلیم وتبلیغ کے لئے گھر بار چھوڑنا۔

اسلام کی اشاعت کے لئے اہل وعیال سے جدا ہونا۔

دین کی خدمت کے لئے وطن کو خیر آباد کہنا۔

بڑا مشکل ہے۔

سینہ پر سِل رکھنے جیسا ہے۔

مگر مذکورہ واقعہ سے ہمیں عبرت لینی چاہیے۔

اس میں ہماری دل بستگی کا سامان ہے۔

اس میں ہمارے لئے ڈھارس ہے۔

اس میں ہمارے لئے نمونہ ہے۔

اس لئے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو جس شخصیت کی جدائیگی کا غم سہنا پڑا۔

جس محبوب کو چھوڑ کر جانا پڑا۔

انہیں جن ساتھیوں سے جدا ہونا پڑا۔

جس دیار کو الواع کہنا پڑا۔

نہ ہمارے گھر والے اس درجے کے!

نہ ہمارا وطن اس درجے کا!

نہ ہمارا دیار اس مرتبہ کا!

نہ ہمارا کوئی محبوب اس رتبہ کا۔

حضرت معاذؓ کی قربانی ہم سے بہت بڑی تھی۔

ان کی جاں نثاری وفداکاری بہت عظیم تھی۔

ان کا یہ عمل ہمارے لئے نشان راہ ہے۔

اس میں ہمارے لئے دو پیغام ہیں:

ایک یہ کہ:

تعلیم وتعلم کے لئے۔

دعوت وتبلیغ کے لئے۔

اصلاح وتربیت کے لئے۔

وعظ وارشاد کے لئے۔

اصلاح اور قیام امن کے لئے۔

انسانیت کو تباہی اور ہلاکت سے بچانے کے لئے۔

اپنے گھر بار کو چھوڑنا۔

اپنے محبوبوں سے جدا ہونا۔

پیارے وطن اور پیاری سرزمین کو خیر آباد کہنا۔

عزیز واقارب کو الوداع کہنا۔

استاد یا شاگرد کو چھوڑ کر جانا۔

محبوب ومحب کو درد فرقت دینا۔

ایک پیغمبرانہ اور صحابیانہ عمل ہے۔

سنت انبیاء اور سنت صحابہ ہے۔

اس میں وہ اجر ہے جو نوافل میں نہیں۔

اس میں وہ ثواب ہے جو سب سے بڑھ کر ہے۔

اس سے خدا اور رسول کی خوشنودی ملتی ہے۔

اس سے اللہ اور اس کے رسول راضی ہوتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ:

اپنی خواہشات کو کچلنا۔

اپنے مَن کو مارنا۔

من چاہی پر عمل نہ کرنا۔

دل کی پکار پر لبیک نہ کہنا۔

بلکہ خدا اور رسول کی فرمائش کو دیکھنا۔

انہیں خوش کرنا۔

اپنی مرضی پر ان کی مرضی کو ترجیح دینا۔

صحابہ کی سنت اور ان کا طریق کار ہے۔

اور یہی ہم سے مطلوب ہے۔

☆☆☆

پیام سیرت

محبت رسول ﷺ اور اس کے تقاضے

محمد قمر الزماں ندوی

جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

Mob. 09506600725

تکمیل ایمان کے لئے محبت رسولؐ شرط اول ہے۔

ایک مومن کے کامل اور سچا مومن ہونے کے لئے شرط ہے کہ اس کے دل میں رسول اللہ ﷺ سے حقیقی محبت اور صحیح عشق ہو۔ وہ اپنی خواہشات کو، اپنی چاہت کو احکام شریعت اور ذات رسالت کے لئے فنا کر دینے والا ہو، اس کی نگاہ میں والدین، اولاد اور سارے لوگوں کے مقابلہ میں حضور اکرم ﷺ کی ذات سب سے محبوب ہو۔ آنحضرت ﷺ نے خود فرمایا لا یؤمن أحدکم حتی أکون احب إلیه من والده وولده والناس أجمعین. تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول! ہر ایک کی محبت مغلوب ہو چکی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اپنی ذت سے تعلق زیادہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا عمر ابھی نہیں، حضرت عمرؓ نے قدرے توقف کے بعد فرمایا کہ اب تو اپنی ذات سے زیادہ آپ کی محبت معلوم ہوتی ہے فرمایا ہاں اب (ایمان مکمل ہوا)، الغرض ایمان جب ہی مکمل ہے اور ایک مسلمان پورا مومن تب ہی ہوسکتا ہے کہ دنیا کے تمام رشتوں سے اور دنیا کے تمام انسانوں سے حتی کہ اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ اس کو رسول ﷺ سے محبت ہو۔

حضرت عروہ بن مسعودؓ کا آنکھوں دیکھا حال:

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کی رسول اللہ ﷺ سے محبت و عقیدت کا یہ حال تھا کہ مشرکین نے بھی اس کی گواہی دی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عروہ بن مسعود ثقفیؓ جب آنحضرت ﷺ سے گفتگو کر کے مشرکین مکہ کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ میں نے عرب وعجم کے بادشاہوں کو دیکھا ہے۔ ان کے درباروں میں گیا ہوں لیکن بخدا میں نے محمد ﷺ کے ساتھیوں کو جتنا محمد کا فدائی دیکھا اس کی مثال مجھے کہیں نہیں ملی، وہ تھوکتے ہیں تو تھوک زمین پر گرنے نہیں پاتا، وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی وہ اپنے ہاتھوں میں لے کر ملتے ہیں۔

حضرات صحابہ کا عشقِ رسولؐ

حضرت خبیبؓ کو جب پھانسی پر لٹکایا گیا تو کسی مشرک نے کہا ہاں اب تو یہ سوچتے ہوگے کہ (معاذ اللہ) محمد (ﷺ) تمہاری جگہ ہوتے اور تم چھوٹ جاتے، حضرت خبیبؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ آپ کے قدم مبارک میں کانٹا چبھے اور میں چھوٹ جاؤں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت وعقیدت کا یہ حال تھا کہ آپؐ کے چشم ابرو کے وہ منتظر رہتے، حکم اور اشارہ ملتے ہی پہلے مرحلے میں عمل شروع فرما

دیتے، کبھی کبھی تفصیل ووضاحت اس کی بعد میں ہوتی، چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے حضرت ابن مسعود مسجد نبوی کے دروازے تک پہنچے تھے کہ آپؐ نے اعلان فرمادیا کہ تمام لوگ بیٹھ جائیں وہ وہیں بیٹھ گئے، آپؐ نے فرمایا اندر آجاؤ، انہوں نے فرمایا کہ آپ کے ارشاد کے بعد اس کی گنجائش ہی کہاں تھی کہ ام عبد کا بیٹا کھڑا رہتا۔

صحابہ کرام کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا خطاب اور لقب ہی اس بنا پر ملا کہ وہ سب رسول اللہ کے اتنے عاشق اور چاہنے والے تھے کہ دنیا کی تمام چاہتیں ان پر قربان تھیں۔ صحابہ کرامؓ آپ کے حکم ہی کے منتظر نہیں رہتے، بلکہ کوئی علامت یا اشارہ بھی مل جاتا جس سے آپ کے رجحان اور قلبی میلان کا پتہ چلتا تو فوراً اسے اپنے سینے سے لگا لیتے اور اسی وقت اس پر عمل شروع کردیتے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جارہے تھے، راستے میں ایک انصاری صحابیؓ کے دروازے پر نظر پڑی جس پر ایک خوبصورت سا قبہ بنا ہوا تھا جس سے بظاہر ٹیپ ٹاپ کا احساس ہورہا تھا۔ صحابہ کرامؓ سے آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ حاضرین نے جواب دیا کہ فلاں شخص کا یہ مکان اور قبہ ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا اس طرح کا مال اس کے مالک کے لئے قیامت کے دن وبال جان ہوگا۔ اس قبہ کے مالک انصاری صحابی کو جب آپ کی کراہت اور ناپسندیدگی کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً قبہ توڑ دیا، دوبارہ جب رسول اکرم ﷺ کا اس راستے سے گزر ہوا تو قبہ نظر نہیں آیا، آپؐ نے قبہ کے بارے میں صحابہ کرامؓ سے پوچھا، تو جواب ملا کہ آپؐ کی ناپسندیدگی کے سبب اس نے قبہ توڑ دیا، آپؐ نے فرمایا اللہ اس پر رحم کرے، اللہ اس پر رحم کرے۔ (ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ ایک دن رسولؐ نے مجھ کو کسم کا رنگا ہوا گلابی رنگ کا کپڑا پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا: یہ کیا ہے؟ میں اس ارشاد گرامی سے سمجھا کہ آپؐ نے میرے اس کپڑے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، چنانچہ میں فوراً گیا اور اس کپڑے کو جلا ڈالا، تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا تم نے اس کپڑے کو کیا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے اس کو جلا ڈالا، آپؐ نے فرمایا: تم نے اس کپڑے کو اپنی کسی عورت کو کیوں نہیں پہنا دیا کیوں کہ عورت کے لئے اس قسم کے کپڑے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مشکوۃ)

چونکہ آنحضرت ﷺ کے اولین مخاطب حضرات صحابہؓ تھے اور انہی کے واسطے سے پوری دنیا میں اسلام کی اشاعت ہونی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو منتخب بنایا تھا۔ اس جماعت کے دل ودماغ پر آنحضرت ﷺ کی محبت وعظمت کے جو گہرے نقوش ثبت ہوئے تھے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ حضرات صحابہ کرام آپ کے جذبات ورجحانات پر بھی دل وجان سے قربان تھے۔ آپ کے فیصلے ان کے لئے آخری فیصلے ہوا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کی زندگی میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملے گی کہ کسی معمولی صحابی نے بھی آنحضرت ﷺ کے احکام، ارشادات وفرمودات سے سرمو انحراف کیا ہو۔

صحابیات کی محبت رسولؐ

آنحضرت ﷺ سے یہ عشق ومحبت اور جاں نثاری صرف مردوں کے ساتھ خاص نہیں تھی بلکہ صحابیات کے اندر بھی عشق نبی اور محبت رسول کا کامل جذبہ موجود تھا، ان کے دلوں میں آنحضرتؐ کے لئے نفس کی قربانی، خواہشات کی قربانی اور جذبات کی قربانی مکمل طور پر پائی جاتی تھی، جس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

ایک مرتبہ بریدہ اسلمی نامی ایک صحابی بہت رنجیدہ خاطر ہو کر دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔ چہرہ سے حزن وملال ٹپک رہا تھا کچھ کہنا چاہتے تھے مگر جھجک رہے تھے، ان کو جب آپؐ نے اس حال میں دیکھا تو شفقت سے پوچھا اسلمی! کیوں اس قدر مغموم ہو، کون سی آفت آپڑی؟ اللہ نے چاہا تو تمہارا غم

راحت میں بدل جائے گا۔انہوں نے عرض کیا: آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں! غلام کی مدت سے آرزو ہے کہ اس کی شادی ہوجائے لیکن اس کی یہ آرزو تو بس ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ میری بدصورتی کی وجہ سے شادی کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے، جہاں بھی پیغام دیا، نفرت وحقارت سے ٹھکرا دیا گیا، اتنا کہنے کے بعد اسلمی کے چہرے پر دکھ درد کے آثار اور بڑھ گئے، محسنِ انسانیت سے رہا نہ گیا فرمایا ''اسلمی'' جاؤ معلوم کرو کہ اس وقت عرب میں سب سے زیادہ خوبصورت کون سی لڑکی ہے؟ میں اس سے تمہاری شادی کراؤں گا۔

اسلمی نے حیرت اور تعجب سے اپنے آقا کے الفاظ کو سنا اور نہایت لجاجت سے عرض کیا! پیارے آقا! بدصورت کی کیا ایسی قسمت کہ کوئی معمولی لڑکی بھی مل جائے، آپ مجھے آزمائش میں نہ ڈالئے۔سرکار نے دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا ''اسلمی! خدا کی ذات پر بھروسہ رکھو، ان شاء اللہ عرب کی منتخب اور خوب صورت لڑکی سے تمہارا نکاح کرایا جائے گا۔ جاؤ تم تحقیق کرو اور مجھے اطلاع دو۔ اسلمی فرمانِ رسول قبول کرتے ہوئے نکل پڑے اور دریافت کرکے خبر دی کہ فلاں قبیلے کے سردار کی لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔آپؐ نے کہا: اسلمی جاؤ لڑکی کے باپ کو میرا اسلام کہو اور کہو کہ محمدؐ نے تمہاری لڑکی کے لئے منتخب کرکے بھیجا ہے۔اسلمی ان کے گھر گئے اور ''علیک سلیک'' کے بعد رسولؐ کا یہ پیغام سنا دیا، اس پر لڑکی کے والد نے برانگیختہ ہوکر اسلمی کو بہت سخت وسست الفاظ کہے اور نہایت حقارت آمیز سلوک کرکے وہاں سے بھگا دیا: وہ مایوس اور بوجھل طبیعت ہوکر لوٹنے لگے۔

ادھر لڑکی نے باپ کو یوں غصہ ہوتے دیکھ کر پوچھا! ابا جان کون آیا ہے اور آپ اس قدر خفا کیوں ہورہے ہیں؟ باپ نے بیٹی سے کہا تم بریدہ اسلمی کو جانتی ہو، بیٹی نے جواب دیا ہاں، ابا جان اچھی طرح جانتی ہوں، عرب کا وہ بدصورت جس کی بدصورتی ضرب المثل بن گئی ہے۔ باپ نے لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے کہا: ہاں وہی آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ رسولؐ نے اس کو تمہارے لئے منتخب کرکے بھیجا ہے۔تو آپ نے کیا جواب دیا؟ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

کیا جواب دیتا جھڑک کر نکال دیا۔ جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ زبان کھینچ لوں۔کمبخت پیام دینے بھی آیا تو میری چاند جیسی بیٹی کو جس کے لئے شرفاء عرب کے کئی نوجوان اپنی پلکیں بچھانے کے لئے تیار ہیں۔ یہ صورت اور یہ ارادے۔

لڑکی نے بے چین ہوکر کہا: ابا جان یہ آپ نے کیا کیا، میں خوب جانتی ہوں کہ آنے والا شخص نہایت بدصورت ہے اور ہرگز آپ کا داماد بننے کے لائق نہیں۔لیکن ذرا یہ تو دیکھئے کس نے بھیجا ہے؟ شاعر کی زبان میں لڑکی نے یوں جواب دیا:

غور کر ابا، نہ اس کے رنگ کالے کو دیکھ
میں یہ کہتی ہوں کہ اس کے بھیجنے والے کو دیکھ
میں نے یہ مانا کہ کالا حسن میں بھی ماند ہے
بھیجنے والا تو ابا چودھویں کا چاند ہے

اس طرح سے صالحہ لڑکی نے باپ کو سمجھایا اور حضور پاک ﷺ کی عظمت کی یاد دہانی کراتے ہوئے کہا کہ فوراً جایئے معافی مانگ کر رضامندی کا اظہار کیجئے! میں تو شادی کے لئے دل وجان سے تیار ہوں۔ چنانچہ وہ صحابی اسلمی کے پہنچنے سے پہلے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنی نادانی کا اظہار کرکے خوشی خوشی اس نسبت کے لئے تیار ہوگئے (بحوالہ شمع راہ)

شادی بار بار نہیں کی جاتی اس لئے لڑکی اور لڑکے کے والدین کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اچھا ماحول اچھا گھرانہ ملے۔لڑکا خوبصورت اور خوب سیرت ہو، لڑکے کے والدین کی بھی دلی تمنا ہوتی ہے کہ لڑکی صورت اور سیرت کی جامع ہو، لڑکے کی طبیعت کے موافق ہو، بسا اوقات تو نباہ کی صورت مشکل ہوجاتی ہے۔اس واقعہ میں بھی اگر حضرت بریدہ اسلمی بذات خود لڑکی کے پاس پیغام لے کر جاتے تو لڑکی انکار کرجاتی لیکن حکم تھا رسولؐ کا، اشارہ تھا آقا مدنی کا، اس لئے اس صحابیہ

نے اپنی خواہشات اور جذبات کو قربان کر دیا اور اس نے اس رشتے کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔

کیا اطاعت اور جانثاری کی ایسی مثال دنیا میں مل سکتی ہے !

اطاعت وتابعداری، جاں نثاری وقربانی اور نقل واتباع کی ایسی مثال دنیا کی کوئی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ دراصل صحابہ کرام کی زندگی نقل واتباع، اطاعت وانقیاد کی بہترین تصویر تھی انہوں نے اپنی زندگی کے رخ کو اس ذات کی طرف کر دیا تھا جس سے بڑھ کر کسی کی زندگی قابلِ تقلید اور لائق اتباع نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے ساری محبت وعظمت کا محور اسی ذات کو قرار دیا تھا جس نے ان کو نئی زندگی عطا کی تھی۔ اس کے آگے کسی محبت وعظمت کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں تھی۔ اور تھی تو اسی کے واسطے سے تھی، اس ذات کے اشارے کے آگے جانیں قربان تھیں۔ صحابہ کرامؓ آپ کے ہر ہر فیصلے پر صرف سرِ تسلیم خم ہی نہیں کرتے بلکہ اس میں شک وتذبذب کی راہ پیدا کرنے والے کو کیفر کردار تک پہنچا دیتے۔

جو رسولؐ کے فیصلہ پر راضی نہیں اس کا یہی صلہ ہے۔

دورِ نبویؐ میں ایک یہودی کا کسی مسلمان سے جھگڑا ہو گیا، بتایا جاتا ہے کہ وہ مسلمان منافق تھا۔ اس لڑائی میں فیصلے کے لئے یہودی نے پیغمبر اسلام رسولؐ اکرم کے پاس جانے کا مشورہ دیا کیوں کہ اس کو یقین تھا کہ آپؐ حق کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتے، بشر نامی منافق جو بظاہر مسلمان تھا اس نے یہود کے سردار کعب بن اشرف کے پاس مقدمہ لے جانے کی رائے دی، تادیر گفتگو کے بعد رسولؐ کے پاس فیصلے کے لئے پہنچے، آپؐ نے یہودی کے حق میں فیصلہ فرمادیا، مسلمان آپؐ کے فیصلے پر راضی نہ ہوا اور حضرت عمرؓ کے پاس یہ مسئلہ لے جانے پر اس نے یہودی کو راضی کر لیا، اس نے سمجھا کہ حضرت عمرؓ کفار کے معاملے میں سخت ہیں۔ وہ یہودی کے حق میں فیصلہ دینے کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔ فاروق اعظمؓ کے پاس جب یہ دونوں پہنچے اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص جو اپنے بارے میں مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس نے اللہ کے نبیؐ کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا ہے تو وہ اندر تشریف لے گئے اور ایک تلوار لا کر اس کو یہ کہتے ہوئے قتل کر دیا کہ جو شخص رسولؐ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اس کا یہی صلہ ہے۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

فلا وربك لا يومنون حتى يحكمون فيما شجر بينهم ثم لا يجدوافى أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلمو تسليما (النساء ٦٥) سو آپ کے رب کی قسم، یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک کہ یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہوں آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا تسلیم کر لیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن)

محبت رسولؐ اور طریقۂ رسول ہی ہماری کامیابی کا زینہ ہے :

لہذا ضرورت ہے کہ ہم مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں آنحضرتؐ کے رجحانات وخیالات کو سو فیصد اپنانے کی کوشش کریں۔ آپؐ سے نسبت رکھنے والی ایک ایک چیز کی عظمت ومحبت ہمارے دل میں ہو۔ آپ کی تعلیمات اور طریقہ ہر چیز پر مقدم ہو۔ بڑی سے بڑی خواہش کی اس کے سامنے کوئی وقعت اور حیثیت نہ ہو۔ جب حضور اکرمؐ کا حکم اور فرمان سامنے آئے تو ہر چیز صحیح ہے۔ جو کھانا آپؐ کو لذیذ اور مرغوب تھا وہ ہمیں مرغوب ہو جو لباس آپؐ کو پسند تھا وہ ہمیں بھی پسند ہو اور الغرض جو چیزیں آپ کو پسند تھیں وہ ہمیں پسند ہو، پھر کیا ہے؟

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

☆☆☆

پیام سیرت

قضیۂ فلسطین اور ہماری ذمہ داری

تحریر: امام حسن البناء شہید
ترجمہ: محمد الغزالی الندوی

نوٹ: یہ اقتباس امام حسن البناء رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خطاب کا حصہ ہے، جس میں افراد ملت کے لئے ایک اہم پیغام ہے اور اسی نسبت سے اس کو شامل اشاعت کیا جا رہا ہے کہ اگر ولادت نبوی کے موقع پر جلسوں کے سلسلہ کو روکا نہیں جا سکتا تو کم از کم انہیں با مقصد تو بنایا جا سکتا ہے۔ (مدیر)

مسلمانو! ولادت نبوی کی مناسبت سے تم سیرت النبی کے جلسے منعقد کرتے ہو، کیا ہی اچھا ہو کہ جہاں تم ان میں عالم اسلام کے بڑے بڑے حادثات کا تذکرہ کرو وہیں مرحوم فلسطین کی حالت زار پر بھی کچھ آنسو بہالو، تم خود بتاؤ کہ کیا یہ چیز تذکرہ کے قابل نہیں ہے کہ بیس سال کے مسلسل جہاد کے بعد کس طرح فلسطین کی صبح شام غریباں میں تبدیل ہو چکی ہے، تم کیا اپنی محفلوں میں اس کا تذکرہ بھی نہیں کر سکتے کہ کس طرح مسلح استعمار آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے بعد فلسطین کو یہودی رنگ میں رنگنے کی آخری تیاریوں میں مصروف ہے، اور کس طرح دسیوں شہداء کو جن میں ایک ۸۰ سال کا بوڑھا بھی تھا تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا، مسلمانوں تمہیں ایسے موقعہ پر ان اسلامی مقدسات کو ضرور یاد کرنا چاہیے جنہیں وہاں بری طرح پامال کیا جا رہا ہے، تمہیں ایسے موقع پر مسجد اقصی کو نہیں بھولنا چاہیے جو قبلۂ اولی اور تیسری سب سے مقدس اسلامی جگہ ہے، استعماری فوجیں اس پر قابض ہو چکی ہیں، وہ بندے اور رب کے درمیان حائل ہو رہی ہیں، وہ نماز پڑھنے والے کو اپنے خدا سے دعا کرنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے سے بھی مانع ہو رہی ہیں، وہاں موذن کی اذان ہتھیاروں کے شور میں بے آواز ہو جا رہی ہے۔ فلسطین کے قاضیوں کا بھی تذکرہ کرو جو اسی حالت میں پکڑے اور گرفتار کیے جاتے ہیں کہ وہ فیصلے جاری کر رہے ہوتے ہیں پھر انہیں اس حالت میں گرفتار کر کے مجرموں کی طرح جیل بھیج دیا جاتا ہے، وہ سینکڑوں قیدی بھی تمہاری توجہ اور تذکرہ کے مستحق ہیں جنہیں پابہ سلاسل رکھا جاتا ہے اور پھر ان سینکڑوں مجاہدین کو بھی تم نہیں فراموش کر سکتے جو اپنے گھروں اور خاندان کو چھوڑ کر اپنے جان و مال کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے اپنا خون دے کر اسلام کا دفاع کرتے ہیں اور راہ خدا میں شہادت سے سرخرو ہو کر دین و وطن پر آنچ نہیں آنے دیتے، مسجد اقصی اور دوسرے اسلامی مقدسات کی حفاظت کی خاطر اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے، ان عورتوں کو بھی فراموش نہ کرو جنہیں فوجیں ان کے گھروں میں بے آبرو کرتی ہیں، اور ان کے زیورات لوٹ لیتی ہیں، اور بعضوں کو تو گرفتار کر کے جیل تک پہنچا دیتی ہیں، ولادت نبوی کے دن ان سب چیزوں کا تذکرہ ضرور ہونا چاہیے، لیکن ایسی یاد اور ایسے تذکرہ کا کیا حاصل جس سے کوئی ایسا نفع بخش عملی اقدام

وجود میں نہ آئے جوان مصائب کوختم کرے اورزیادتی کرنے والوں کولگام دے، سارے مسلمان مل کراگرکوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کر سکتے، اور فلسطین کے مسائل کوحل کرنے کے لیے نیز وہاں کے رہنے والوں اور مسجد اقصی کے لئے لڑنے والوں کو تقویت پہنچانے کے لئے کوئی عملی اقدام نہیں کرتے تو پھر مسلمانوں کے ان آنسوؤں اورآہوں کی بھی کیا قیمت رہ جاتی ہے جووہ صبح وشام فلسطین کی حالت زار پر بہاتے ہیں۔

اس لئے تمام مسلمانوں پرضروری ہے کہ وہ ولادت نبوی کے دن کویوم فلسطین قراردیں، جس میں وہ وہاں کی جانے والی ظالمانہ سیاست پراپنا احتجاج درج کرائیں وہاں شہید ہونے والوں کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھیں، فلسطینیوں کی مدد کے لئے اجتماعات منعقد کریں، اوروہاں کے ہزاروں مصیبت زدوں کی امداد کے لئے فنڈ اکٹھا کریں فلسطینیوں کے تئیں جو چیزیں ہم پرضروری ہیں انمیں سے یہ بعض وہ یہ چیزیں ہیں جوہم اس موقع پر کرسکتے ہیں۔

دلوں کی گہرائیوں سے نکلنے والا یہ وہ پیغام ہے جسے مصر کے اخوان المسلمین ساری دنیا کے ہرمسلمان مردوعورت تک پہنچانا چاہتے ہیں، بلکہ ہر باضمیر اورشریف انسان کو ہم اس مبارک عمل میں شریک کرنا چاہتے ہیں، تاکہ سب اپنی طاقت کے بقدراس موقع پرفلسطین کومصائب سے نکالنے کی فکرکریں۔

امید ہے کہ مسلمان اس دن یہ بات ثابت کریں گے وہ مضبوط بنیادوں والی عمارت کی طرح ہیں، وہ ایک ایسی جماعت ہیں جس کی صفوں میں کوئی رخنہ نہیں ڈال سکتا، اور ساری دنیا کے سامنے یہ بات واضح کردیں گے کہ فلسطین کا مسئلہ سارے مسلمانوں کا مسئلہ ہے، اوروہ اس کے حقوق کے تئیں ذرہ برابربھی کوتاہی سے کام نہیں لیں گے۔

إن فی ذلك لـذكـری لمن كان له قلب أو ألقی السمع وهو شهيد.

☆☆☆

نعت

ہم اپنے کاندھوں پہ بارگراں اٹھاتے ہیں
زمیں پہ رہتے ہیں اور آسماں اٹھاتے ہیں

اشارے نعت کے ایمان والا سمجھے گا
''زبان کا لطف کہیں بے زباں اٹھاتے ہیں''

کہاں چلی گئی بازار مصر کی گرمی!
یہ کون آیا کہ آزر دکاں اٹھا تے ہیں

ہم اپنی ذات کا غم بھی اٹھا نہیں پاتے
مگر وہ ہیں کہ غم دوجہاں اٹھاتے ہیں

بھلائے بیٹھے ہیں مغرب کی بارشوں کا عذاب
عقیدتوں کا جو بے چھت مکاں اٹھاتے ہیں

جھمکنے لگتا ہے وہ آستاں نگاہوں میں
سوال سجدوں کا جب آستاں اٹھاتے ہیں

نبیؐ کے عشق کا سرمایہ جن کے پاس نہیں
سنا لحد میں بڑی سختیاں اٹھاتے ہیں

عجب نہیں وہ سر حشر سرفراز کرے
ہمارے ناز شہؐ انس وجاں اٹھاتے ہیں

رئیس ہی سہی لیکن فقیر طیبہ ہوں
وہ جانتے نہین جو انگلیاں اٹھاتے ہیں

رئیس الشاکری

☆☆☆

شاہ راہ عمل

روشن مستقبل کی شاہراہ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

جب سائنس اور عہد حاضر کے علوم کی تحصیل کو مضمون کا عنوان بنایا جاتا ہے تو فوراً بعض علماء دین کے ذہن میں یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ مضمون نگار دین سے بے بہرہ ہے، اس کی نگاہ میں علوم دینیہ اہمیت نہیں رکھتے یا وہ زمانہ کے فیشن کا دلدادہ ہے اور علوم اسلامیہ کا مخالف ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک بنیادی دینی تعلیم ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے اور یہ سب سے مقدم فریضہ ہے اور اپنے عقیدہ کی اور ملی تشخص کی حفاظت کے لئے دینی تعلیم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

بنیادی دینی تعلیم ہر شخص کے لئے ضروری ہے لیکن علوم دینیہ میں اختصاص کمال اور مہارت ہر شخص کے لئے لازمی نہیں، اگر ہر شخص علم دین میں اختصاص پیدا کرنے لگے گا تو علوم عصریہ کے ماہرین کہاں سے آئیں گے جن کے بغیر دنیا میں قوت وطاقت اور عزت واقتدار کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور نہ کوئی زندہ اور ترقی یافتہ قوم ان علوم کو نظر انداز کرسکتی ہے ۔انسان کے دوش ناتواں پر خلافت کا بارگراں ڈالا گیا ہے، خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے دنیا کے انتظام وانصرام اور ایجادات اور ہر ہنر کا جاننا ضروری ہے، اس لئے عصری علوم بھی دینی علوم ہیں ۔قرآن میں ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت آدم کو اشیاء کے اسماء کا علم سکھایا تھا مفسرین نے لکھا ہے کہ اسماء سے مراد مسمیات یعنی اشیاء کے خواص ہیں اور اسی کا نام سائنس ہے اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ دنیا میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہیں، اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ دوسری قوموں کی جارحیت کا نشانہ نہ بنیں، اگر وہ چاہتے ہیں کہ زمانہ کا رولر انہیں پامال کرتا ہوا آگے نہ بڑھے، اگر وہ چاہتے ہیں کہ ایجادات وانکشافات میں ان کا بھی حصہ ہو، اگر وہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں ناقابل تسخیر قوم بن جائیں تو انہیں جدید علوم میں دست گاہ اور مہارت حاصل کرنی ہوگی کہ اس کے بغیر طاقت اور ترقی کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کی یہ تعلیم بالکل درست ہے کہ:

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں وقت کے علوم کی تحصیل پر توجہ کی ، بنو عباس کی حکومت کے زمانہ میں جب یونانی علوم کا ستارہ اقبال بلند ہوا اور ان علوم کے ذریعہ عقیدہ اسلامی پر تاخت وتاراج شروع ہوئی تو مسلمان علماء نے اور بالخصوص امام غزالی نے ان جدید علوم کو داخل نصاب کیا اور ان علوم کو اسلام کے دفاع کا ذریعہ بنایا۔ مسلمانوں نے ان

علوم میں مہارت پیدا کرلی تھی۔جس طرح یونانی علوم اسلامی علوم نہیں تھے لیکن مسلمانوں نے ان کو سیکھا اسی طرح مغربی علوم بھی اسلامی علوم نہ سہی لیکن مسلمان ان جدید علوم میں پہلے ہراول دستہ کی حیثیت رکھتے تھے اور مسلمانوں سے ہی یورپ نے ان علوم کو حاصل کیا تھا،اب اگر مسلمان ان کو سیکھیں گے تو خود اپنی ہی گمشدہ میراث کو حاصل کریں گے لیکن مسلمانوں نے اپنے دور تنزل میں علم کو جدید وقدیم اور دینی اور دنیوی کے خانوں میں تقسیم کردیا اور اب اس تقسیم پر ان کو ایسا اصرار ہے جیسے یہ بھی کوئی شرعی تقسیم ہو اور منزل من اللہ ہو۔اور جیسے ہر قدیم مقدس ہو اور ہر جدید مکروہ۔اس خود ساختہ اور غلط تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس دینیہ کے فضلاء اور عصری دانش گاہوں کے فارغین کے درمیان بے گانگی کے پردے حائل ہوگئے ہیں۔ ایک زمانہ کے تقاضوں سے ناواقف اور طاقت کے سرچشمہ سے بے خبر اور دوسرا احکام دین سے ناآشنا اور ملت کے مسائل سے بیگانہ۔ایک کے پاس وہ کشتی نہیں جو طوفانوں کا مقابلہ کرسکے، دوسرے کے پاس کشتی ہے لیکن ساحل نجات کا اسے علم نہیں۔

اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا،اب وقت آگیا ہے کہ اس خلیج کو پاٹنے کی سنجیدہ کوشش شروع کی جائے،دینی تعلیم کے جو مدارس ہیں ان میں جدید علوم کو اس حد تک ضرور داخل کیا جائے کہ مدارس عربیہ کا فارغ التحصیل زمانہ کے تقاضوں کو سمجھ سکے اور صحیح رہبری کرسکے،اسی طرح سے مسلمانوں کے عصری تعلیم کے اداروں میں دینی تعلیم اتنی ضرور دی جائے کہ طالب علم کو حلال وحرام کا فرق معلوم ہو اور وہ اپنے اسلامی تشخص کے بارے میں غیرت منداور باحمیت ہو۔

حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی شکست اور ہزیمت کا اور دوسری قوموں کی فتحمندی کا بنیادی سبب مسلمانوں کا صنعت اور ٹکنالوجی میں پیچھے رہ جانا ہے۔مسلمان اپنی علمی اور صنعتی پسماندگی کی وجہ سے دوسری قوموں کی جارحیت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔قرآن اور سیرت کے مطالعہ سے ہمیں وقت کے علوم کے حصول کی صرف نصیحت نہیں بلکہ تاکید اور تلقین ملتی ہے۔لیکن ہمارا دین کا مطالعہ اتنا ناقص اور نقطہ نظر اتنا محدود ہے کہ ہم نے صرف مسجدوں میں نماز کی ادائیگی کو دین سمجھ لیا ہے۔بلاشبہ مسجدوں میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے،روزہ، زکوۃ اور حج اسلامی فریضہ ہے لیکن دفاع کے لئے قرآن میں جہاد اور بلند ترین معیار کی اسلحہ سازی کے احکام بھی موجود ہیں،جن کا تذکرہ کبھی کسی واعظ کی زبان پر نہیں آتا ہے۔ مسلمان حکومتوں کے لئے ان پر عمل فرض ہے،افسوس ہے کہ خلیجی ملکوں نے سیال سونے کے سمندر سے مالا مال ہونے کے بعد بھی قرآن کے حکم کو پامال کیا ، اور پوری قوم کو صارفین کی قوم بنادیا،حالانکہ اس بے پناہ دولت سے صنعتی انقلاب آسکتا تھا،مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں ایسے حق پسند اور بیباک علمائے دین نہیں جو جرأت کے ساتھ شہنشاہوں کا گریبان پکڑ سکیں اور ان کی غلطی پر ٹوک سکیں ،قرآن اور حدیث کی ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جو انسان کو حق گو اور حق پرست نہ بنا سکے ۔ جہاد کے صحیح تصور کو سامنے لانے کی ضرورت ہے اور فضائل نماز اور فضائل ذکر کی طرح فضائل جہاد بھی مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جدید اسلحہ سازی اور اعلی درجہ کی ٹکنولوجی کے حصول کو دینی ضرورت اور شرعی حکم سمجھا جائے تاکہ مسلم حکومتیں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں،تاکہ مسلمان دنیا میں طاقتور ہوں،تاکہ دوسری قومیں مسلمانوں کو روند نہ ڈالیں،مسلمان ملکوں کو پامال اور شکستہ حال نہ کرڈالیں۔علم کی غلط طور پر دینی اور دنیوی تقسیم کی بیخ کنی کی

ضرورت ہے اور مسلمانوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جدید علوم اور فنون اور صنعت وحرفت اور ٹکنالوجی کا حصول بھی دینی کام ہے کہ اس کے بغیر مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال نہیں ہوسکتی ہے۔ مسلمان اگر عظمت کی باز آفرینی کے لئے جدید علوم میں امامت کا مقام حاصل کریں گے تو وہ عنداللہ بھی ماجور ہوں گے اور دنیا میں بھی معزز ہوں گے۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ سائنس اس کائنات کے بارے میں اکتساب علم کا نام ہے اور اس علم اور تجربہ کو عملی لباس پہنانا ٹکنالوجی ہے۔ قرآن مجید میں نظام کائنات پر غور وفکر اور تدبر کرنے اور آفاق وانفس کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہی سائنس کا مفہوم ہے، قرآن میں طاقت اور بلند معیار کی اسلحہ سازی کا حکم ہے اور یہ چیز ٹکنالوجی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ جدید علوم محض دنیاوی چیزیں ہیں اور اسلام سے ان کا ربط نہیں غلط ہے۔ اسلام کے جامع نظام کو ذہن نشین کرنے اور کروانے کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات ہمیشہ مستحضر رکھنے کی ہے کہ اسلام کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں کو بہتر بنانا ہے۔ جب تک یہ چیز حاصل نہیں ہوگی دین کا تصور محدود ہوگا اور مسلمان کبھی اس دنیا میں سربلند اور باعزت نہیں ہوسکیں گے۔ ایک اچھے صاحب ایمان اور صاحب اخلاق انسان ہونے کے ساتھ ایک مسلمان کے لئے جدید علوم وفنون سے لیس ہونا بھی ضروری ہے۔ حدیث میں حکمت اور علم کو مسلمانوں کی گمشدہ میراث قرار دیا گیا اور اس پر مسلمان کا استحقاق دوسروں سے بہت زیادہ ہے۔ عبادت اور خلافت دونوں کے تقاضوں کو ہم آہنگ اور باہم مربوط کرنا ایک مسلمان رہبر عالم دین کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، اور جو عالم دین اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا اس کی رہبری خام اور ناتمام ہے، اس کی فکر ناقص اور نامکمل ہے۔ ایمان اور علم جدید کی اس جامعیت کے بغیر اور روحانی اور مادی طاقت کے امتزاج کے بغیر مسلمان ذہنی کمال اور قوت اختراع اور عزت وشوکت سے محروم رہیں گے۔ دینی کام کرنے والی شخصیتیں اور جماعتیں جس قدر جلد اس حقیقت کو سمجھ لیں اتنا ہی ان کے حق میں اور مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ روحانی اور مادی دونوں طاقتوں کو بہم کیا اور پھر مسبّب الاسباب پر بھروسہ کیا لیکن اسباب کا کبھی انکار نہیں کیا، کیونکہ یہ اسباب بھی مسبب الاسباب کے پیدا کردہ ہیں اور ان کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تقریروں میں اسباب کی نفی کرنا اور خوارق عادات اور کرامات کے قصے سنانا، مچھروں کو چھاننا اور اونٹ کو نگل جانا، امت کی ہمالیائی غلطیوں سے بے خبر رہنا، مثبت اور تعمیری انداز فکر نہیں ہے، یہ سب بے عقلی، بے عملی بے خبری، تعطل اور خواب غفلت کا وہ انجکشن ہے جس سے مسلمان اور بھی زیادہ تنزل کا شکار ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے، جب مسلمانوں نے آفاق وانفس پر غور وفکر کے نتیجہ میں سائنس کو اپنی دسترس میں کرلیا تو سائنسی علوم خدمت خلق کا ذریعہ بنے اور ان سے فلاح وبہبود کا کام لیا گیا اور سائنس اور خدا پرستی میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا، لیکن جب سائنس پر یوروپ کی قوموں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے سائنس کو الحاد اور بے دینی کے فروغ کا ذریعہ بنالیا اور نئی دریافتیں دنیا میں شر وفساد کے پھیلانے کا ذریعہ اور وسیلہ بن گئیں، اقبال کی آواز فضا میں اب بھی گونج رہی ہے۔

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

☆☆☆

بحث و تحقیق

سلام اور جوابِ سلام میں "وبرکاتہ" کے بعد "ومغفرتہ" وغیرہ کا اضافہ جائز یا ناجائز --- ایک تحقیقی بحث

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی (استاذ دارالعلوم حیدرآباد)
Email:mtalam800@gmail.com

سلام کرنے کا افضل طریقہ یہ ہے کہ "السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته" کہا جائے، یہی حکم جواب کا بھی ہے؛ لیکن بعض روایتوں میں "وبرکاتہ" کے بعد "ومغفرته" کا اضافہ وغیرہ بھی منقول ہے، اُن کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ معمول بہا ہے یا نہیں؟ ذیل میں اس حوالے سے ایک تحقیقی اور علمی بحث پیش کی جارہی ہے۔

اگر بات سنت کی کی جائے تو مسنون یہی ہے کہ السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته پر اضافہ نہ کیا جائے "وبرکاته" سلام کی انتہا ہے اور اِس پر اضافہ کرنا خلافِ سنت ہے۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یا عائشة! هذا جبرئیل یُقرأ علیكِ السلامَ، فقلت: وعلیه السلام ورحمة الله وبرکاته، فذهبت تزید، فقال النبي ﷺ: إلی هذا انتهی السلام، فقال: (رحمة الله وبرکاته علیکم أهل البیت)

اے عائشہ! یہ جبرئیل تھے، تمہیں سلام کہہ رہے ہیں، میں نے کہا: وعلیہ السلام ورحمة الله وبرکاته، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اِس پر اضافہ کرنے لگیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سلام کی حد یہیں تک ہے، پھر آپ نے (مذکورہ آیت) پڑھی (اللہ کی رحمت اور برکات تم پر ہوں اے اہل بیت!) (بخاری، رقم: ۳۰۴۵، بدء الخلق)

(۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں سند جید کے ساتھ محمد بن عمرو بن عطاء سے روایت نقل کی ہے: وہ کہتے ہیں: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا، آپ کے پاس ایک یمنی شخص داخل ہوئے اور سلام یوں کیا: السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، ثم زاد شیئاً مع ذلك پھر مزید کچھ کلمات کہے، حضرت نے، جو اُن دنوں بینائی سے محروم ہوگئے تھے، کہا: کون ہے؟ لوگوں نے کہا: ایک یمنی صاحب ہیں جو آپ کے پاس آتے رہتے ہیں؛ چناں چہ لوگوں نے اُن کا تعارف کرایا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: إن السلام انتهي إلی البرکة سلام کی انتہا برکت تک ہے۔ (موطا مالک، رقم: ۱۷۲۸، باب العمل فی السلام)

(۳) اسی روایت کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں بھی نقل کیا ہے، اس روایت میں کچھ اضافہ ہے:

ایک سائل آیا اور آپ کو سلام کیا اور کہا: السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ومغفرته ورضوانه اور اِس کو اُس سے شمار کیا (یعنی ومغفرته ورضوانه کو سلام کا حصہ خیال کیا) تو ابن عباس نے کہا: ما هذا السلام؟ وغضب حتی احمرت وجنتاه یہ کیسا سلام ہے؟ اور غصہ ہوئے؛ یہاں تک کہ آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، پھر آپ کے

بیٹے علی نے آپ سے کہا: اباجان! یہ مسئلہ پوچھنے والا ہے، آپ نے کہا: إن الله حدّ السلام حداً وينهى عما وراء ذلك ثم قرأ "رحمة الله وبركاته عليكم أهل البيت انه حميد مجيد" بے شک اللہ نے سلام کی ایک حد مقرر کردی ہے اور اس سے زائد سے منع فرمایا ہے، پھر آیت پڑھی رحمة الله وبركاته عليكم أهل البيت انه حميد مجيد (ہود:۷۳)(شعب الایمان، رقم:۸۸۷۸، فصل فی کیفیۃ السلام)

(۴) زہرہ ابن معبد کہتے ہیں: کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انتهى السلام إلى "وبركاته" حافظ ابن حجر نے کہا: اس کے رجال ثقہ ہیں۔(فتح الباری:۱۱/۶، رقم الحدیث:۸۸۷۸)

(۵) ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یوں سلام کیا: السلام عليك ورحمة الله وبركاته ومغفرته، تو ابن عمر نے اسے ڈانٹا اور کہا: حسبك إذا انتهيت إلى "وبركاته" إلى ما قال الله عزوجل یعنی تیرے لیے کافی ہے جب تو "وبركاته" تک پہنچے، جو اللہ تعالیٰ نے کہا (ابن عمر کی مراد وہی آیت تھی جو اوپر گذری) (ہود:۷۳)(شعب الایمان:۸۸۸۰)

(۶) حضرت یحییٰ بن سعید سے مروی ہے: کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک شخص نے یوں سلام کیا، السلام عليكم ورحمة الله وبركاته والغاديات والرائحات ابن عمر نے جواباً کہا: تمہارے اوپر ہزار مرتبہ ہو. راوی کہتے ہیں: ابن عمر نے ایسا جواب، اس سلام کے طریقے کو ناپسند کرنے کی وجہ سے دیا (گویا طنزاً جواب تھا) کیوں کہ اُس نے وبرکاتہ کے بعد والغادیات کا اضافہ کردیا تھا۔(موطا مالک، رقم:۱۷۳۳)

(۷) پیچھے عمران بن حصین کی روایت نقل کی گئی ہے، جس میں السلام عليكم ورحمة الله وبركاته تک کا تذکرہ ہے، جس پر تیس نیکیاں ملتی ہیں اُس میں اِس کے بعد کچھ الفاظ کا تذکرہ نہیں ہے۔(ابوداؤد:۵۱۹۵)

(۸) ہندیہ میں ہے: ولا ينبغي أن يزاد على البركات، قال ابن عباس رضي الله عنهما: لكل شيء منتهى، ومنتهى السلام، البركات كذا في المحيط. ہندیہ:۵/۳۲۵)

(۹) صاحب منتقی علامہ باجی لکھتے ہیں: سلام کے تین اجزاء ہیں (۱) السلام عليكم (۲) ورحمة الله (۳) وبركاته، جس کسی نے ایک یا دو جزوں پر اکتفا کیا تو کافی ہے اور جس نے تینوں اَجزاء کو جمع کیا تو اُس نے مقصود کو حاصل کرلیا اور جب مقصود حاصل ہوگیا تو اُس پر اضافہ کرنا درست نہیں۔(المنتقی:۴/۲۸۰)

(۱۰) امام محمد نے موطا محمد میں لکھا ہے: إذا قال: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، فليكفف؛ فإن اتباع السنة أفضل یعنی اگر سلام کرنے والے نے سلام یوں کیا السلام عليكم ورحمة الله وبركاته تو اب وہیں رک جائے، اضافہ نہ کرے؛ کیوں کہ سنت کی پیروی بہرحال افضل ہے۔(موطا امام محمد:۳۸۵)

اور موطا امام محمد کے شارح علامہ لکھنوی نے اس قول کی شرح میں لکھا ہے:

العمل الكثير في بدعة ليس خيرا من عمل قليل في سنة وظاهره أن الزيادة على "وبركاته" خلاف السنة مطلقاً. (التعلیق الممجد مع موطا امام محمد:۳۸۵)

بدعت میں عمل کثیر، سنت میں عمل قلیل سے بہتر نہیں ہے یعنی سنت کا عمل چاہے تھوڑا ہی ہو بدعت میں زیادتی عمل سے بہر حال بہتر ہے؛ پس ظاہر یہی ہے کہ وبركاته پر اضافہ مطلقاً خلافِ سنت ہے۔ تلك عشرة كاملة.

خلاصہ کلام: مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ سلام کا ادنیٰ درجہ السلام عليكم ہے، اس پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر السلام عليكم ورحمة الله کہا جائے تو بیس نیکیاں اور

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته سلام کا اعلیٰ درجہ ہے، اس پر تیس نیکیاں ملتی ہیں، اور یہی حکم جواب کا بھی ہے؛ البتہ جواب ہمیشہ سلام کے مقابلہ میں اچھے الفاظ میں دینا چاہیے یعنی اگر کوئی صرف السلام علیکم کہے تو جواباً وعلیکم السلام ورحمة الله کہنا افضل ہے اور السلام علیکم ورحمة الله کسی نے کہا تو جواباً وعلیکم السلام ورحمة الله وبرکاته کہنا افضل ہے، اور اگر کسی نے ابتداءً ہی السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته کہہ دیا تو جواب میں وبرکاته پر اضافہ مسنون نہیں؛ کیوں کہ وبرکاته ابتداءً اور جواباً سلام کی حد ہے اور سنت سمجھتے ہوئے حد کو پار کرنا درست نہیں۔

شواهد ومویدات:

مذکورہ دلائل کے علاوہ اس مسئلہ کے دیگر مویدات اور شواہد بھی ہیں۔

(۱) تشہّد میں سلام کے الفاظ بھی "وبرکاته" پر ختم ہوتے ہیں: السلام علیك أیها النبي ورحمة الله وبرکاته. (مسلم، رقم:۸۷۲)

(۲) نماز سے نکلنے کے سلام کے عام الفاظ، جو احادیث صحیحہ کثیرہ سے ثابت ہیں وہ رحمة الله تک ہیں؛ جب کہ بعض احادیث میں وبرکاته بھی ثابت ہے؛ لیکن وبرکاته پر اضافہ کسی روایت میں نہیں ہے۔ علقمہ بن وائلؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

صلیت مع النبي ﷺ فکان یُسَلِّم عن یمینه السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته. (ابوداؤد:۱/۱۵۰)

(۳) امام بیہقی نے شعب الایمان میں زہرہ بن معبد کی روایت نقل کی ہے:

عروہ بن الزبیر کو ایک آدمی نے یوں سلام کیا: السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته تو عروہ نے کہا: ما ترك لنا فضلا إن السلام انتهى إلى وبرکاته کہ اس نے ہمارے لیے کوئی فضیلت نہیں چھوڑی؛ بے شک سلام کی انتہا وبرکاته تک ہے۔ (شعب الایمان، رقم الحدیث:۹۰۹۶)

اِس کی مزید تفصیل "رموز سلام" کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

اُن روایات کا علمی جائزہ جن میں "وبرکاته" پر اِضافه هے: کتب حدیث میں کچھ روایتیں ایسی ملتی ہیں، جن سے "وبرکاته" پر اضافہ ثابت ہوتا ہے، ذیل میں چند روایات کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

(۱) حدثنا إسحاق بن سوید الرملي، حدثنا أبو مریم، أظن أني سمعت نافع بن یزید قال: أخبرني أبو مرحوم، عن سهل بن معاذ بن أنس، عن أبیه، عن النبي ﷺ بمعناه، زاد ثم أتى آخر، فقال: السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ومغفرته. فقال: أربعون قال: هکذا تکون الفضائل.

.....پھر ایک اور آدمی آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ومغفرته تو آپ ﷺ نے فرمایا: (ان کے لیے) چالیس نیکیاں ہیں اور فرمایا: فضیلت وثواب میں ایسے ہی اضافہ ہوتا ہے۔ (ابوداؤد:۵۱۹۶، باب کیف السلام)

ابوداؤد نے یہ روایت اُس روایت کے بعد متصلاً ذکر کی ہے، جس میں تیس نیکیوں کے ملنے کا تذکرہ ہے، جس کے راوی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ہیں، مذکورہ بالا حدیث کے راوی معاذ بن انس رضی اللہ عنہ ہیں، اِس میں ومغفرته کا اضافہ ہے، نیز اِس پر چالیس نیکیوں کے ملنے کا تذکرہ ہے۔

جائزہ: لیکن علمی اعتبار سے یہ حدیث قابل استدلال نہیں، صاحب اوجز المسالک نے اِس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: علامہ منذری فرماتے ہیں: کہ یہ حدیث ضعیف ہے؛ کیوں کہ سندِ حدیث کا ایک راوی ابو مرحوم عبد الرحیم بن میمون ہے، اِس کی روایات قابل استدلال نہیں ہوتیں۔ (اوجز:۱۷/۱۷۶) ابوحاتم کہتے ہیں: یُکتبُ حدیثُه ولا یُحتَجُّ به اس کی حدیث لکھی جائے گی؛ مگر استدلال نہیں کرسکتے۔ (میزان الاعتدال:۵۰۳۷)

اِسی حدیث کے دوسرے راوی ہیں سہل بن معاذ، اِن کو بھی یحییٰ بن معین نے ضعیف کہا ہے؛ اگر چہ ابن حبان نے اِنہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔(میزان: رقم:۳۵۹۲)

حافظ ابن حجر نے تقریب میں عبدالرحیم بن میمون کو صَدوق اور سہل بن معاذ کو لا بأس به کہنے کے باوجود اِس حدیث کے بارے میں کہا ہے: کہ اِس کی سند ضعیف ہے۔(فتح الباری:۸/۱۱)

حدیث کے راوی ابن ابی مریم نے دوسرے راوی نافع ابن یزید کے بارے میں، سند کے اندر کہا ہے: میرا گمان ہے کہ میں نے نافع بن یزید سے سنا ہے، یعنی اُنہوں نے سماعت کا جزم اور یقین بیان نہیں کیا ہے؛ چناں چہ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

ولا يثبت هذا الحديث؛ فإن له ثلاث علل: إحداها، أنه من رواية أبي مرحوم عبد الرحيم بن ميمون، ولا يُحتَجُّ به.

الثانية: أن فيه أيضا سهل بن معاذ وهو أيضا كذلك

الثالثة: أن سعيد بن أبي مريم أحَدُ راويه لم يَجزِم بالرواية؛ بل قال: أظن أني سمعت نافع بن يزيد. (زادالمعاد:۲/۴۱۷، فصل صیغۃ السلام)

اب حاصل یہ نکلا کہ ابوداؤد کی مذکورہ روایت ضعیف ہے، اور اُن روایات کے مقابلہ میں جن میں، وبرکاتہ پر اضافہ نہیں ہے یا منع کیا گیا ہے، قابلِ استدلال نہیں۔

(۲) حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ حضور ﷺ کے پاس سے ایک جانور چَرانے والے صاحب گذرتے تھے، تو یوں سلام کرتے تھے "السلام عليك يا رسول الله! تو رسول اللہ ﷺ جواب یوں دیتے: وعليك السلام ورحمة الله وبركاته ومغفرته ورضوانه.....الحديث (عمل اليوم والليلة لابن السنی: رقم:۲۳۵، منتہی ردالسلام)

اس حدیث میں "وبرکاتہ" پر دو الفاظ ومغفرتہ ورضوانہ کا اضافہ ہے؛ لیکن مذکورہ حدیث ضعیف ہے، محققین کی آراء پڑھئے:

علامہ نووی کہتے ہیں: رويـنـا في كتاب ابن السني بإسناد ضعيف عن أنس (الاذکار:۲۰۹)

حافظ ابن حجر کہتے ہیں: وأخـرج ابـن السـني في كتابه بسندٍ واهٍ من حديث أنس (فتح الباری:۶/۱۱)

حافظ ابن القیم لکھتے ہیں: وأضـعف مـن هـذا، الحديثُ الآخر عن أنس (زادالمعاد:۲/۴۱۸)

خلاصہ یہ کہ مذکورہ حدیث ابوداؤد والی حدیث سے بھی زیادہ ضعیف ہے اور بقول ابن حجر: اس کی سند واہی تباہی ہے، لہٰذا وبرکاتہ پر اضافہ کی مسنونیت پر استدلال درست نہیں۔

(۳) عن زيد بن أرقم قال: كنا إذا سلم النبي ﷺ علينا، قلنا: وعليك السلام ورحمة الله وبركاته ومغفرته. زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب نبی ﷺ ہمیں سلام کرتے تو ہم جواب میں وعليك السلام ورحمة الله وبركاته ومغفرته کہتے تھے۔(شعب الایمان: رقم:۸۸۸۱، فصل فی کیفیۃ السلام)

اس حدیث پر بھی شارحینِ حدیث نے کلام کیا ہے؛ چنانچہ محقق حافظ ابن حجر کہتے ہیں: وأخـرج البيهـقـي في "الشعب" بسندٍ ضعيف أيضا، من حديث زيد بن أرقم. (فتح الباری:۶/۱۱)

حاصل گفتگو: الغرض سلام وجوابِ سلام میں ومغفرتہ وغیرہ کے اضافہ کے جواز کے بارے میں یہ چند روایات ذکر کی گئیں؛ جن کا حال ظاہر ہوا کہ علمی اعتبار سے ضعیف ہیں؛ جب کہ دوسری طرف سلام اور جوابِ سلام کا "وبرکاتہ" پر ختم ہونا اور اُس پر اضافہ کے عدم جواز کی روایات سامنے آگئیں؛ لہٰذا اب مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ ابتداءً اور جواباً دونوں صورتوں میں سلام کی آخری حد وبرکاتہ ہے اور یہی مسنون ہے۔

حافظ ابن حجر کی رائے:

حافظ ابن حجر شارحِ بخاری نے اِن روایات پر گفتگو کرتے

ہوئے اخیر میں لکھا ہے:

وهذه الأحاديث الضعيفة إذا انضمّت قوي ما اجتمعت عليه من مشروعية الزيادة على "وبركاته" یعنی وہ روایات جنہیں محدثین نے ضعیف کہا ہے، اگر انہیں جمع کیا جائے اور اُن کے شواہد وتوابع کو دیکھا جائے تو کم از کم اتنا تو ثابت ہوسکتا ہے کہ "السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته" پر اضافہ مشروع ہے۔(فتح الباری:۱۱/۶)

شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کی رائے:

موطا مالک کے حنفی شارح شیخ الحدیث صاحب نور اللہ مرقدہ اوجز المسالک میں لکھتے ہیں:

اِن روایات سے زیادہ سے زیادہ "وبرکاته" پر اضافہ ثابت ہوسکتا ہے؛ لیکن سنتِ سلام کا مصداق وہی روایات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "وبرکاته" پر اضافہ نہ کیا جائے؛ رہ گئی یہ بات کہ ابوداؤد کی وہ روایت جس میں "ومغفرته" کے اضافہ پر آپ ﷺ نے چالیس نیکیوں کے حصول کی بات کہی ہے، تو وہ کسی مخصوص حال یا عارض کی وجہ سے ہے۔

ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل کا ثواب متعین ہوتا ہے اور اس میں کبھی کسی عارض کی وجہ سے زیادہ ثواب مل جاتا ہے؛ لیکن اس عارضی چیز پر مسئلہ کا مدار نہیں ہوتا؛ بلکہ پہلا طریقہ ہی معمول بہ اور مسنون ہوتا ہے، اِس کی نظیر صحیح مسلم کی وہ روایت ہے، جو حضرت انسؓ سے مروی ہے: کہ ایک صحابی نماز کی صف میں اُس وقت شامل ہوئے؛ جب کہ ان کی سانسیں پھول رہی تھیں، انہوں نے کہا: **الله أكبر، الحمدُ لِلهِ حَمْداً كَثيراً طَيِّباً مَبَارَكاً فِيهِ،** اِسی روایت میں آگے ہے کہ حضور نے فرمایا: کہ میں نے بارہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ اِن کلمات کی جانب سبقت کررہے ہیں (مسلم، رقم الحدیث: ۶۰۰، فضل قول الحمد للہ) بخاری کی روایت میں ہے کہ ایسا واقعہ قَومَہ میں پیش آیا تھا اور حضور ﷺ نے فرمایا: کہ تقریباً تیس فرشتے اِس کلمے کو لینے میں سبقت کررہے تھے (رقم الحدیث: ۷۹۹) اور نسائی کی روایت میں ہے کہ آپ کے پیچھے، ایک صحابی نماز پڑھ رہے تھے کہ انہیں چھینک آگئی، انہوں نے **الحمد لله حمدا كثيرا طيباً مباركا فيه** کہہ دیا۔(رقم الحدیث:۹۳۱)

الغرض واقعہ تکبیر تحریمہ کا ہو یا قومہ کا یا نماز میں چھینک آنے کا، بہر حال اتنا طے ہے کہ اِن مواقع پر، اِن الفاظ کا کہنا، معمول بہا اور مسنون نہیں ہے؛ حالاں کہ اِس ذکر کی خاص فضیلت حضور ﷺ نے بیان کی ہے؛ لہٰذا جیسے یہاں اِس ذکر کی فضیلت کے باوجود، اِس کا مسنون ہونا لازم نہیں آتا، ٹھیک اِسی طرح "وبرکاته" پر اضافہ کی وجہ سے چالیس نیکیوں کی فضیلت جو بیان کی گئی ہے، لازم نہیں آتا کہ وہ بھی مسنون ہو؛ الغرض اختلاف مسنون ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں ہوا، رہ گئی گنجائش کی بات، سو اضافہ کی گنجائش ہے۔(خلاصہ اوجز المسالک:۱۷/۱۷۷)

چناں چہ علامہ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں:

فالأولى: القول بتجويز ذلك أحيانا، والاكتفاء على "وبركاته" أكثرياً.

یعنی اکثر اور عمومی احوال میں تو وبرکاته پر اضافہ نہ کیا جائے، کبھی کبھار ومغفرته وغیرہ کا اضافہ ہوگیا تو کوئی حرج نہیں ہے۔(التعلیق الممجد علی موطا امام محمد:۳۸۵)

مفتی سعید صاحب زیدہ مجدہ لکھتے ہیں:

پس فیصلہ کن بات یہ ہے کہ عام طور پر "وبرکاته" تک ہی اضافہ کرنا چاہیے؛ لیکن اگر کوئی اور اضافہ کرے تو یہ بھی جائز ہے۔(تحفۃ الالمعی:۶/۴۷۰)

خلاصہ: احیاناً جوازِ اضافہ ثابت ہے؛ البتہ اختلاف، اضافہ کی سنیت کے بارے میں ہوا، اور سنت یہ ہے کہ اضافہ نہ کیا جائے، گو جائز ہے؛ جواز اور سنت کا فرق یاد رکھنا چاہیے۔

☆☆☆

فقہی مباحث

(قسط-۲)

غذا کے احکام اور علاج کی شرعی مصلحتیں

تحریر: مولانا عبدالباسط ندوی امارت شرعیہ پٹنہ
ترجمہ: ڈاکٹر اشرف علی ندوی ازہری، دارالعلوم ندۃ العلماء لکھنؤ

نوٹ: یہ اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط ھے ، اس کی پہلی قسط دو ماہ پہلے اکتوبر کے شمارہ میں شائع ھوئی تھی، کسی وجہ سے یہ وقفہ ھوگیا جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ھے۔ (ادارہ)

علاج ومعالجہ

بلا شبہ علاج ومعالجہ انسان کی حفاظت اور اسکی سلامتی کیلئے ہے، اور یہ وہ ضرورت ہے جس کا اعتبار شریعت اسلامی کے اہم مقاصد میں گیا ہے، اسلئے کہ اس حالت میں انسان پر وہ تمام چیزیں غالب آجاتی ہیں جو حالت تندرستی اور صحت میں اس کے برعکس ہوتی ہے اور وہ انسان کو غیر میانہ روی اور برے مزاج کی طرف تبدیل کر دیتی ہیں، جس سے وہ پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس صورت کی اصلاح کیلئے شریعت نے علاج ومعالجہ کو جائز تسلیم کیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک علاج کی تین قسمیں تھیں:

۱) فطری دواؤں کے ذریعہ علاج ۲) دعاؤں اور خدائی دواؤں کے ذریعہ علاج۔۳) کبھی مذکورہ دونوں صورتوں کو اپنا کر علاج کرنا(۱)۔

آپؐ نے اپنی امت کے ایک قائد کو ایک مہم پر بھیجا اور آپؐ نے انہیں اس کا مشورہ دیا اور ہمیں بھی علاج کی اجازت دے دی، چنانچہ اسامہ بن شریکؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کے پاس آیا اور اس وقت صحابہ کرام مجلس میں اس طرح بیٹھے تھے جیسے ان کے سروں پر پرندے ہوں، میں سلام کر کے بیٹھ گیا، ایک اعرابی آپؐ کے پاس آکر کہنے لگا، اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم دوا کرا سکتے ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا، ہاں! دوا کیا کرو، بلا شبہ اللہ نے ہر بیماری کی دوا بھی اتاری ہے سوائے ایک بیماری کے، اور وہ ہے انتہائی بڑھاپا(۲)۔

اللہ کے نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالی نے کوئی بیماری نازل نہیں فرمائی مگر اس کی شفا بھی اتاری ہے (۳) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہر بیماری کیلئے دوا ہے، جب کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے دوا اس کو ٹھیک کر دیتی ہے“(۴) اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالی نے ہر بیماری کیلئے دوا رکھی ہے سوائے موت کے“(۵)۔

ہمارے سامنے علاج ومعالجہ کے میدان کھلے ہیں جیسا کہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے کہا ہے، طب گویا شریعت ہے، جو سلامتی اور عافیت کو حاصل کرنے کیلئے اور ہلاکت و بیماری کو دور کرنے کیلئے وضع کی گئی ہے اور اس چیز کو دور کرنے کیلئے جسکا اس کے ذریعہ دور کرنا ممکن ہو اور اس چیز کو حاصل کرنے کیلئے جسکا حصول ممکن ہو(۶)۔

وہ احوال جن میں علاج کرانا ضروری ہے :

انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی صحت کی حفاظت کرے، اور نقصان دہ چیزوں سے خود کو دور رکھے، جب کوئی بیماری یا بری عادت لاحق ہو تو اسکا علاج کرائے، اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہوئے کہ وہی شفا دینے والا ہے، اور اسکے علاوہ کوئی شفا نہیں دے سکتا، کبھی کسی بیماری کا علاج کرانا ضروری ہوتا ہے تا کہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ بیماری ہلاکت وبربادی کا سبب بنتی ہے، آپریشن کرانا، علاج کرانا پورے طور پر بیماری کو ختم کر دیتا ہے، ایسے حالات میں ضروری ہے کہ علاج ومعالجہ کو اختیار کیا جائے۔

درج ذیل حالات میں انسان کو علاج ومعالجہ کرانا واجب ہے :

☆ معدہ کے امراض جو دوسری بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔

☆ وہ مہلک بیماریاں جو ہلاکت اور دوسرے حوادث کا سبب بنتی ہیں۔

☆ جب بیماری پیٹ اور مہلک کے علاوہ ہو لیکن وہ اس وقت جبکہ علاج نہ کرایا جائے زیادتی اور دائمی رکاوٹ کا سبب بنے۔

☆ ایسی بیماری جو متعدی نہ ہو اور نہ ہی انسان کو گھبرا دینے والی ہو، نیز دائمی بھی نہ ہو لیکن علاج ومعالجہ نہیں کیا جائے گا تو وہ بیماری طول پکڑ لے گی اور تیمارداروں اور مریض کے گھر والوں پر ان کی ضرورتوں کا پورا خیال کرنا گراں گزرے گا، نیز وہ مریض کسی لائق نہیں رہ جائیگا، اسی کے ساتھ ساتھ اس کے اہل خانہ کو سوائے نقصان کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، لہذا ان تمام حالتوں میں جبکہ علاج کرانا ممکن ہو، اور اس میں کوئی خطرہ بھی نہ ہو، بلکہ ظن غالب ہو کہ دوا سے فائدہ ہوگا تو اسکا علاج کرانا واجب ہے (۷)۔

انسان کو ان حالات میں علاج ومعالجہ کو اختیار کرنا واجب ہے، اسلئے کہ علاج نہ کرانا نفس کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے، یہ نص قطعی سے حرام ہے، اللہ تعالی نے فرمایا :''ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ''(بقرۃ:۱۹۵) اور اللہ کے رسولؐ نے عام آدمی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے منع کیا ہے(۸) چنانچہ اسی طرح بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہے جن میں رسولؐ نے علاج ومعالجہ کی ترغیب دی ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا دوا تقدیر کے مقابلہ میں نفع پہنچاتی ہے؟ تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: دوا بھی تقدیر کی ایک قسم ہے، اللہ تعالی جسے چاہتا ہے نفع پہنچاتا ہے(۹)۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے فن طب کے علم کے بارے میں پوچھا، انھوں نے تعجب کرتے ہوئے کہا: اللہ کی بندی ! میں آپ کی فقاہت کے سلسلہ میں تعجب نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میں تو عرض کر رہا ہوں کہ آپ یقیناً رسول خدا ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ہیں، اور آپ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی ہیں، اور اللہ کے رسول لوگوں میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے، لیکن تعجب کر رہا ہوں آپؓ کے فن طب کے علم کے بارے میں کہ یہ کیسے ہوا؟ اور کہاں سے حاصل کیا؟ حضرت عائشہؓ نے اسکے مونڈھے پر مارا پھر کہا: اے عرویہ (عروہ کی تصغیر) اللہ کے رسولؐ آخیر عمر میں بیمار ہوئے تھے، اور عرب کے وفود چہار جانب سے آپؐ کے پاس آتے تھے۔ اور میں علاج کرنا سیکھتی تھی جہاں تک ہو سکتا تھا، اور ایک روایت میں ہے عرب وعجم کے اطباء آپ کے علاج کیلئے بھیجے جاتے تھے تو میں ان سے سیکھتی تھی (۱۰)۔

تو اللہ کے رسولؐ کے عمل سے بڑھ کر کون سی دلیل ہے، مزید یہ کہ یہ عمل توکل کے منافی نہیں ہے، اسلئے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ دوا تقدیر کی ایک قسم ہے، تو خدا کی قدرت کا ہونا توکل کے منافی نہیں ہے، اس اعتقاد کے ساتھ علاج ومعالجہ شفا نہیں دیتا بلکہ اللہ تعالی شفا دیتا ہے اور ہر چیز اسکے قبضۂ قدرت میں ہے،(۱۱) اور اسی طرح ہے جیسا کہ ہم کھاتے ہیں اور پیتے ہیں اس کے

باوجود اللہ ہمیں کھلاتا ہے اور ہمیں پلاتا ہے اور قرآن کریم میں سیدنا ابراہیم کی زبانی ذکر فرمایا: "والذی ھو یطعمنی ویسقین واذا مرضت فھو یشفین " ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: تم میں میری طرح کون ہے؟ میں رات اس حال میں گذارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا ہے پلاتا ہے (۱۲)، ان سب کے باوجود لوگ اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں، اور ذریعہ معاش کو اختیار کرنا اللہ نے ہم پر فرض کر دیا ہے، حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: تمام فرائض کے بعد حلال روزی حاصل کرنا فرض ہے (۱۳) اور آپؐ سے یہ بھی روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت سعد بن وقاصؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم اپنی آل واولاد کو مالدار چھوڑ کر جاؤ یہ تمہارے لئے اس چیز سے بہتر ہے کہ تم انہیں محتاج چھوڑو، اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، تم جو کچھ بھی خرچ کرو، اس سے اللہ کی رضا چاہو اور تمہارا اجر اللہ کے پاس ہے وہ تمہیں دیا جائیگا حتی کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں کوئی لقمہ رکھو (۱۴)۔

حرام اور نجس چیزوں کے ذریعہ علاج ومعالجہ کا حکم : طب اور علاج ومعالجہ کا مقصد صحت بدن کی حفاظت ہے، لیکن علاج ومعالجہ صرف انہیں اشیاء کے ذریعہ ہوسکتا ہے جن کو اللہ تعالی نے جائز قرار دیا ہے اور رسولؐ نے اجازت دی ہے، یقیناً شفاء انہیں چیزوں کے ذریعہ مل سکتی ہے، نہ کہ محرمات کے ذریعہ، مگر اللہ نے مجبوری کی حالت میں جبکہ انکا بدل موجود نہ ہو تو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے کہ "جب کوئی شخص مجبور ہو جائے اور وہ حد سے گزرنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ، ہو تو ایسے شخص کیلئے (ان کے استعمال میں) کوئی گناہ نہیں ہے۔ (البقرۃ/۱۷۳)

وائل خضرمی سے مروی ہے کہ طارق بن سوید الجعفی نے آپ سے شراب کی بابت دریافت کیا تو آپؐ نے انکو منع فرمایا، اور اس کے استعمال کو ناپسند فرمایا، تو طارق نے کہا کہ میں اس کو بطور دوا استعمال کرتا ہوں تو آپ نے فرمایا: "وہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے" (۱۵)

حضرت عبدالرحمٰن بن عثمانؓ فرماتے ہیں کہ ایک طبیب نے آپؐ سے مینڈھک کی دوا بنانے کے سلسلہ میں دریافت کیا تو آپؐ نے اسکو اس کے قتل سے منع فرمایا (۱۶)۔

صاحب "عون المعبود" کا کہنا ہے کہ آپؐ کے قول "فی دواء" کا مطلب یہ ہے کہ مینڈھک کو اسکے علاوہ دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر دوا بنائی جاسکتی ہے اور ان کو بطور دوا شفایابی کیلئے استعمال کریں، مینڈھک کا قتل اس غرض سے کہ اس کو دوا بنا کر علاج ومعالجہ میں استعمال کریں یہ امر موقوف ہے اس کے مارنے پر، اور اسکا مارنا یہ فعل حرام ہے، لہذا اس کے ذریعہ علاج بھی حرام ہے (۱۷)۔

حضرت ابو ہریرہ ناقل حدیث ہیں کہ "آپؐ نے نجس اشیاء کو بطور دوا استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے (۱۸)۔

حضرت ابو داؤد روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا "بے شک بیماری ودوا یہ دونوں چیزیں اللہ تعالی ہی کی تخلیق کردہ ہیں، پھر ہر بیماری کیلئے دوا بھی اسی کی پیدا کردہ ہے، لہذا تم لوگ اسی کے ذریعہ سے علاج کیا کرو، اور محرمات سے بچا کرو" (۱۹)۔

عبداللہ بن عمر کے متعلق روایت کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک طبیب کو اپنے بعض اہل خانہ کی دوا دارو کیلئے بلوایا، اور یہ شرط لگا دی کہ وہ کسی بھی حرام شئی کا علاج میں استعمال نہ کرے (۲۰)۔

یہ وہ نصوص ہیں جو محرمات کے ذریعہ علاج کرنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں لیکن اضطراری حالت میں اور بدل نہ ہونے کی صورت میں شئی حرام میں ایک محدود مقدار جائز ہے جس سے اضطراری حالت کا ازالہ ہوسکے اور ضرورت کی تکمیل ہو سکے، کیونکہ اس وقت صرف اسی میں انسان کی جان کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "جو مجبور ہو جائے اور وہ حد سے بڑھنے اور زیادتی کرنے والا نہ ہو، اس پر ان اشیاء کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے" (البقرۃ/۱۸۳) اور دوسری جگہ

ارشاد ہے ''اللہ تعالی نے ان سب جانوروں کی تفصیل بتلادی ہے جنکو تم پر حرام قرار دیا ہے مگر سخت ضرورت میں وہ بھی مباح ہیں (الانعام/۱۱۹) اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ ''اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو'' (البقرہ/۱۹۵)

ارشاد باری تعالی ہے ''اور اپنے آپ کو قتل مت کرو یقیناً اللہ رب العزت تم پر نہایت مہربان ہے (النساء/۲۹۰) چنانچہ اگر کسی شخص نے ان اشیاء کے ذریعہ علاج ترک کر دیا، باوجودیکہ اس کو ان سے شفایابی پر ظن غالب ہے، تو گویا اس نے خود اپنے آپکو ہلاکت میں ڈال دیا، انھیں آیات ودلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہاء نے محرمات کے ذریعہ سے علاج کو مباح قرار دے دیا اس وقت جبکہ ان کے ذریعہ سے فائدہ پر ظن غالب ہو اور اسکا کوئی بدل موجود نہ ہوں، اور یہ حکم نجس چیزوں کے ذریعہ علاج کا ہے، خواہ وہ نشہ آور ہوں، یا نہ ہو، کیونکہ انسان کی صحت کی درستگی اور اس کی جان کی سلامتی ضرورت واضطرار کا حکم رکھتی ہے، اسی لئے شریعت نے محرمات کو مباح قرار دے دیا ہے (۲۱)

یہاں پر انسانی اعضاء وجوارح کے ذریعہ کئے جانے والے کچھ علاج اور ایک انسان کا خون دوسرے انسان کو دینے اور انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا ذکر کیا جارہا ہے خواہ وہ مردہ ہوں یا زندہ، یہ وہ تمام علاج ومعالجہ ہیں جنکو علماء نے ضرورت کے وقت چند شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے، اور ان سب کو حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے فقہاء کی عبارات اور نصوص کی روشنی میں اپنی کتاب ''فقہ الحلال والحرام'' میں نہایت عمدگی کے ساتھ لکھا ہے، ہم ان کو ان کی کتاب کے حوالہ سے یہاں یہ ذکر کرتے ہیں، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

☆ انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا جدید طبی طریقہ انسانی توہین پر مشتمل نہیں ہے۔

☆ یہ پیوندکاری صرف اس شرط پر جائز ہے کہ اس سے انسانی جان کی حفاظت مراد ہو، یا بدن کے کسی اہم منافع کا اعادہ مدنظر ہو، مثلاً بینائی وغیرہ۔

☆ جبکہ ماہر طبیب کا یہ کہنا ہو کہ ان اشیاء سے مریض کی شفایابی پر ظن غالب ہے۔

☆ غیر مسلموں کے اعضاء کے ذریعہ مسلمانوں کے جسم کی پیوندکاری جائز ہے۔

☆ مردار کے اعضاء کو اسکی رضامندی سے استعمال کرنا جائز ہے اس وقت جبکہ اسکی زندگی ہی میں اس سے اجازت لے لی گئی ہو، کیونکہ وہی اپنے بدن کا مالک ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس کے ورثاء کی بھی رضامندی ضروری ہے۔

☆ زندہ شخص کے کسی عضو کو لینے کیلئے اس کی اجازت ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو اسے کوئی ضرر شدید پہونچنے کا امکان بالکل نہ ہو۔

☆ اعضاء کی سپلائی اور انکو فروخت کرنا بھی جائز ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح سے انکا خریدنا اور فروخت کرنا شوافع وحنابلہ کے یہاں جائز ہے، مگر احناف کے یہاں صرف انکا خریدنا جائز ہے، وہ بھی مجبوری کی حالت میں، لیکن انکا بیچنا جائز نہیں ہے، یہی درست ہے اسلئے کہ یہی چیز انسانی احترام کے مناسب معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم، کیونکہ اللہ ہی کا علم سب سے اتم ومحکم ہے (۲۲) اور یہ بات آشکارا ہوگئی کہ بوقت ضرورت محرمات کا استعمال بطور علاج درست ہے، اور ان دواؤں کا بھی جن میں کوئی نجس یا حرام چیز ملی ہوئی ہو، اس شرط کے ساتھ کہ اسکا کوئی بدل موجود نہ ہو۔

خاتمہ

امید کی جاتی ہے کہ حلال دواہر بیماری کیلئے مہیا ہے، چنانچہ آپ ؐ نے اس بات کی طرف اپنے اس قول میں رہنمائی بھی فرمادی ہے ''بیشک اللہ نے کوئی بیماری نہیں پیدا کی ہے مگر اسکا علاج بھی فراہم کر دیا ہے'' جس نے اسکو سمجھنے کی کوشش کی تو اس نے سمجھ لیا اور جس نے کوشش نہ کی تو وہ اس سے ناواقف رہا'' سوائے ''سام'' کے تو صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ! سام کیا چیز ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: موت ہے (۲۳)

یہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اطباء کو ان بیماریوں کیلئے نئی دواؤں کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے جو روز بروز بڑھتی جارہی ہیں، تجربہ سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ بہت سے ایسے نئے امراض پیدا ہوگئے ہیں جنکا ماضی میں کوئی علاج مہیا نہ تھا، مگر دور جدید میں بآسانی مہیا ہے، کاش صحت کے معاملات میں دلچسپی لینے والے افراد اور تجربہ کار مسلم اطباء و مسلم حکومتیں اس پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔

لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ دواؤں وغذاؤں پر مکمل طور سے یہود ونصاریٰ کا قبضہ ہے، اور وہ ذرہ برابر محرمات اور نجس اشیاء سے اجتناب نہیں کرتے۔ اور نہ ہی حلال وحرام کے درمیان کوئی امتیاز کرتے ہیں، اور وہ بذات خود ان دواؤں وغذاؤں کو پورے عالم میں منتقل کرتے ہیں، اور بہت سے مسلم اطباء محرمات کے سلسلہ میں جانکاری کے باوجود بے پرواہ ہوکر ان کے اوصاف بیان کرتے ہیں، بلکہ ان محرمات کے ذریعہ تیار شدہ دواؤں کو اپنے دوا خانوں اور شہروں میں استعمال کرتے ہیں، جو انتہائی افسوس ناک بات ہے۔

ھائے افسوس!

حالانکہ دواؤں اور غذاؤں کے استعمال کا مقصد یہ ہے کہ اس میں بدن کی درستگی اور عقل وروح کی صحت ودرستگی کی صلاحیت موجود ہو، اور اس کے منافع ایسے ہوں کہ جو انسان کو ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا پابند بنا سکیں جو اس پر ان عبادات ومعاملات میں سے لازم ہیں، جن کو دیکر آپ ؐ کو مبعوث فرمایا گیا۔

آج کے زمانہ میں مذہب اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جسکی تعلیمات واحکام اس بات پر قادر ہیں کہ وہ انسانیت کو ہلاک کن دواؤں وغذاؤں سے بلکہ تمام مہلک اشیاء سے بچا سکیں، ہائے افسوس! کاش انسان اس دین حنیف کی پختگی وثابت قدمی کے ساتھ پیروی کرتا تو دنیا وآخرت کی سعادت مندی سے بہرہ ور ہوتا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے اس کی مرضیات کو بجالانے کے طلبگار ہیں، اللہ کا درود وسلام ہو نبی اکرم ؐ اور ان کے اہل بیت اور تمام صحابہ کرام پر، ہر طرح کی ثنائے جمیل اللہ ہی کیلئے ہے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔

حواشی:

(۱) تکملۃ فتح الملہم / للشیخ محمد تقی عثمانی نقلا عن زاد المعاد / لابن القیم: ۲۹۲/۴،
(۲) مسند لامام احمد: حدیث: ۱۸۴۵۴
(۳) صحیح البخاری: حدیث: ۵۶۷۸،
(۴) الصحیح لمسلم، کتاب الطب: حدیث: ۵۸۷۱
(۵) المستدرک للحاکم: حدیث: ۸۲۲۰،
(۶) قواعد الاحکام فی مصالح الانام: ۷/۱
(۷) الملخص من احکام التداوی / للدکتور محمد علی البار: ص ۲۱،
(۸) المستدرک للحاکم: ۲۳۴۵،
(۹) کنز العمال: حدیث: ۲۸۰۸۲،
(۱۰) مسند احمد ومجمع الزوائد للہیثمی: ۱۵۳۱۵،
(۱۱) طب نبوی: للامام الذھبی، زاد المعاد: لابن القیم، المنہج السوی والمنہل الروی: للسیوطی،
(۱۲) الصحیح البخاری: حدیث: ۱۹۶۵
(۱۳) السنن الکبریٰ للبیھقی: حدیث: ۱۲۰۳۰،
(۱۴) الصحیح للبخاری: حدیث: ۱۲۹۵
(۱۵) معناہ فی شرح معانی الآثار / للطحاوی: باب حکم ما یؤکل لحمہ: ۱۷۷/۱ (۱۶) سنن ابی داؤد: حدیث: ۳۸۷۳،
(۱۷) عون المعبود: ۲۹۸/۲،
(۱۸) سنن ابی داؤد: حدیث: ۳۸۷۲،
(۱۹) سنن ابی داؤد: حدیث: ۳۸۷۶،
(۲۰) المستدرک للحاکم: حدیث: ۷۵۱۰
(۲۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: کتب الفقہ فی الھندیۃ والبزازیۃ والدر المختار وغیرھا من الکتب۔
(۲۲) فقہ الحلال والحرام: ۱۶۴
(۲۳) المستدرک للحاکم: ۸۲۲۰

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

عبادت کا قرآنی تصور اور مسلم قوم کا طرزِ عمل

محمد انس فلاحی سنبھلی
اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ

کوئی قوم جب زوال کا شکار ہوتی ہے تو سب سے زیادہ ضرب اس کے افکار ونظریات پر پڑتی ہے۔اس کے سوچنے سمجھنے کا انداز یکسر تبدیل ہوکر رہ جاتا ہے۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افکار ونظریات پر مبنی اعمال میں رفتہ رفتہ تبدیلی واقع ہونے کا عمل غیر محسوس طریقے سے شروع ہوجاتا ہے۔چنانچہ اصول کی جگہ فروع اور کُل کی جگہ جز پر توجہ مرکوز ہوجاتی ہے، چہ جائیکہ وہ اصل الاصول کی طرف پلٹیں۔گردشِ زمانہ ان کے فکر وعمل پر ایک دبیز تہہ ڈال دیتی ہے۔یہی حال ہماری قوم کا ہوا ہے۔فکری زوال کا نتیجہ ہے کہ عبادت کی حقیقت تک سے قوم لاعلم ہے۔عبادت کو چند مخصوص مراسم تک سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔عبادت کا تصور ہمارے لیے اتنا غیر واضح ہوکر رہ گیا ہے کہ عابد کو مخصوص افعال وحرکات اور مخصوص وضع وقطع سے پہچانا جانے لگا ہے۔الغرض جو ہمارا مقصدِ وجود وتخلیق ہے ہم اس سے قدرے بیگانہ ہوچکے ہیں، اور عبادت کے نام پر بے شمار خرافات وبدعات میں الجھے ہوئے ہیں۔علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

حقیقت خرافات میں کھوگئی
یہ امت روایات میں کھوگئی

عبادت کا معنی ومفہوم:

عبادت عبد سے مشتق ہے۔عبد کا لفظ قرآنِ کریم میں ۱۵۲ جگہ اور ۱۴۰ آیتوں میں آیا ہے۔عربی لغت کے لحاظ سے عبادت کے تین معنی ہیں: ۱۔پوجا اور پرستش ۲۔اطاعت وفرمانبرداری ۳۔بندگی وغلامی۔انہی تینوں معانی میں یہ لفظ قرآن میں مستعمل ہوا ہے۔

﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْن☆وَأَنْ اعْبُدُونِيْ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ (سورہ یس: ۶۰-۶۱)

''اے بنی آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے، اور میری ہی عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے۔''

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُلُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُواْ لِلّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُون﴾ (سورہ البقرۃ: ۱۷۲)

''اے ایمان والو! اگر تم نے واقعی ہماری عبادت اختیار کی ہے تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔''

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں اللہ کی اطاعت وبندگی اور پرستش اسی کے لیے مخصوص کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ان معانی کے لحاظ سے عبادت کو تین اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پوجا

اور پرستش کا تعلق ان عقائد وفرائض سے ہے جو حقوق اللہ کے ضمن میں آتے ہیں، یعنی اللہ ہی کو سجدہ کیا جائے، اسی کے آگے جھکا جائے، اسی سے استعانت طلب کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں عظمت وجلالت اور عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔

اطاعت وفرمانبرداری کے معنی یہ ہیں کہ انفرادی، عائلی وخاندانی اور سماجی زندگی میں اس کے احکامات بجالائیں۔ نیز اس کا تعلق حقوق العباد سے بھی ہے، یعنی معاشرتی زندگی سے متعلق جو احکام وفرامین ہیں انہیں من وعن اپنی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ نفسانی خواہشات وآرزوؤں اور خاندانی رسم ورواج کی بالکل پروانہ کی جائے۔

بندگی وغلامی کا مطلب یہ ہے کہ انسان ریاستی نظام میں بھی اللہ کی بندگی وغلامی کو قبول کرے۔ جس طرح اپنی انفرادی وعائلی اور سماجی ومعاشرتی زندگی میں احکامِ الٰہی کا مطیع وفرمانبردار بن کر رہنا ہمارے لیے ضروری ہے، اسی طرح ہماری ریاست کی عدلیہ ومقننہ بھی شریعت کی پابند ہو۔ نظم ونسق چلانے کے لیے جدید سہولیات اور دستیاب وسائل سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

عبادت کے اس وسیع تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے اللہ کی بندگی کا دم بھرا جائے۔ یہ نہیں کہ پوجا اور پرستش تو خدا کی، اور معاشرتی معاملات میں نفس کی بندگی، اور ریاستی نظام میں طاغوت کی بندگی کی جائے۔ ورنہ بعید از امکان نہیں کہ ہماری ایسی عبادت عنداللہ قبول ہونا تو درکنار، منہ پر دے ماری جائے گی۔

اعبدوااللہ :انبیاء کی دعوت کا محور

ابتدائے آفرینش سے تمام انبیاء کی یہی دعوت رہی کہ اے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ انبیا کے مبعوث ہونے کا ایک سلسلہ ہے جس کا آغاز آدمؑ سے ہوا اور اختتام خاتم المرسلین حضرت محمدؐ پر ہوا۔ سب کی دعوت یہی تھی، سب کا پیغام یہی تھا۔ زمان ومکان مختلف رہے ہیں۔ انبیاء کے مقصدِ بعثت کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ﴾ (سورہ النحل: ۳۶) ''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب لوگوں کو خبردار کر دیا کہ ''اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔''

ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحاً إِلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ إِنِّيَ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ (سورہ الاعراف: ۵۹) ''ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ مجھے تمہارے سلسلے میں ایک ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔''

سورہ اعراف میں ہود علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: ﴿وَإِلَى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوداً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ أَفَلاَ تَتَّقُونَ﴾ (سورہ الاعراف: ۶۵) ''اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا، اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے۔''

اسی سورہ کے دوسرے مقام پر حضرت صالحؑ کی دعوت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحاً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ﴾ (سورہ الاعراف: ۷۳) ''اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے''۔

ان تمام آیات سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے

کہ تمام انبیا کی دعوت کا مرکز ومحور عبادت ہی رہا ہے۔اس لیے اس کی تفہیم اس حوالے سے دوچند اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے، ورنہ انبیاء کی دعوت پر ایمان بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

عبادت :مقصد حیات ہے، جزوِحیات نہیں

عبادت زندگی کا حصہ نہیں، زندگی کا مقصد ہے۔اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔عبادت کو مخصوص افعال ومخصوص اوقات تک محدود کر دینا قرآنی فکر کے خلاف ہے۔عبادت مقصدِ زندگی ہے،مقصدِ وجود ہے اور مقصدِ تخلیق ہے۔قرآنِ کریم میں ارشادِ باری ہے:﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (سورہ الذریات: ۵۶) ''میں نے جن اور انسان کو اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

جب عبادت مقصدِ زندگی ہے تو اس سے غفلت،اس سے لاپروائی،اس سے تساہلی جرم نہیں تو اور کیا ہوگا!اس پر مزید ستم یہ کہ عبادت کا غیر قرآنی تصور اپنے ذہنوں میں بسائے ہوئے چند مخصوص اعمال مخصوص ایام میں کر لیے جائیں، بقیہ اوقات میں من مانی زندگی گزاری جائے۔عبادت کو دن کے کسی حصے میں ادا کر لینا ویسے ہی ہے جیسے غیر مسلم حضرات صبح کے وقت چند منٹ کے لیے پرارتھنا کرتے ہیں۔ہمارے لیے عبادت جزوِزندگی نہیں،مقصدِ زندگی ہے،دن میں پنجگانہ نماز اس کے استحضار کا ذریعہ ہے۔عبادت تو اللہ کی مکمل بندگی کا نام ہے۔بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی کے یہاں ہمہ وقتی ملازم ہو اور وہ وہاں چند منٹ یا چند گھنٹے گزار کر دوسرے کے یہاں بھی ملازمت کرے اور اس حرکت پر مالک خفا بھی نہ ہو!

کیا اللہ محتاجِ عبادت ہے؟

یہ سوال ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ ہم سے اپنی اطاعت وفرمانبرداری،پوجا اور پرستش اور بندگی وغلامی کیوں چاہتا ہے؟کیا اس کے بغیر اس کی الوہیت میں فرق آسکتا ہے؟ کیا اس کی بادشاہت کے لیے ضروری ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں؟اس کا مختصر جواب یہ ہوسکتا ہے کہ بندوں کی بے بندگی سے اللہ کی بادشاہت میں ذرا بھی فرق نہیں آسکتا ہے،کیونکہ وہ محتاجِ عبادت ہی نہیں ہے،وہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے نیازمند ہیں۔اللہ کی عبادت وبندگی سے اللہ کی شان میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ بندہ ہی کامیابی وکامرانی کے منازل بسہولت طے کرتا چلا جاتا ہے۔گذشتہ قوموں کی تاریخ بھی اس بات کی شہادت پیش کرتی ہے کہ اللہ کی نافرمانی وسرکشی سے اس کی عظمت وجلالت پر کوئی حرف نہیں آیا، بلکہ وہ خود ہی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئیں۔لیکن جن لوگوں نے اللہ کی بندگی وغلامی کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھا آج بھی وہ زندہ وجاوید ہیں،تاریخ ان کا بڑے احترام واہتمام سے ذکر کرتی ہے۔اللہ کی رحمت وشفقت پر غور کیا جائے تو یہ بات خود عیاں ہو جائے گی کہ اس کی عبادت محض قانونی ہی نہیں بلکہ دل کی آمادگی اور پوری مستعدی کے ساتھ کرنی چاہیے۔اس نے ہمیں وجود بخشا،بصارت کے لیے دو آنکھیں،سماعت کے لیے دو کان، چلنے کے لیے دو پیر،سوچنے کے لیے دماغ اور کام کرنے کے لیے دو مضبوط ہاتھ عنایت فرمائے۔کیا وہ اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے؟اور شکر کا بہترین ذریعہ اس کی بندگی ہے۔انسان کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ ربِ کریم کے اس بے پایاں انعام واکرام کے باوجود اس کی بندگی سے روگردانی کرے،اس کی اطاعت سے سرکشی کرے اور اس کے طریقے سے منھ موڑے۔یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اللہ نے انسان کو اختیار کی آزادی دی ہے، اسے کسی کام کے لیے مجبور نہیں کیا ہے۔ارشادِ باری ہے:﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً﴾ سورہ الدھر:

۳) ''ہم نے اسے راستہ دکھادیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔'' دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (سورہ البلد : ۱۰) ''اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے دکھادیے۔''

اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ آفاق وانفس کی نشانیاں دیکھ کر ان پر غور کرکے فطرت میں موجود راستہ منتخب کرکے اللہ کا عابد وشاکر بننا پسند کرے، یا پھر وہ آفاق وانفس کی نشانیوں سے منھ موڑ کر نفس کی بندگی اور شیطان کی بندگی غیر محسوس طریقے سے قبول کرکے راہِ حق سے دور ہوجائے، اور اس چند روزہ زندگی سے خوب لطف اندوز ہولے اور آخرت کی دائمی وابدی نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محرومی کو گوارا کرلے۔

غیر قرآنی تصورِ عبادت کے نتائج :

عبادت کے اس غیر قرآنی تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ امت نے اس کے مختلف درجے بنالیے ہیں۔ عابد کے لیے اعلیٰ درجے کی عبادت یہ قرار پائی کہ وہ تطہیرِ قلب کے لیے خانقاہوں کا رخ کرے اور چند دنوں کے لیے گھر بار اور سماج کو چھوڑ کر اور ان کے حقوق وفرائض کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی دور دراز مقام پر دعوت کا فریضہ انجام دے۔ یہ تصور صرف عوام تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ یہ یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبہ اور اساتذہ پر بھی خاصا اثر انداز ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی ہفتے عشرے میں تعلیم ترک کرکے دعوت کے لیے نکلنے کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے ذہن میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ یہ تعلیم خارج از دین ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی میں شاملِ نصاب ہر رطب ویابس کو دینی تعلیم کا حصہ نہیں قرار دیا سکتا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے علم کی کوئی تفریق نہیں کی ہے، ہر وہ علم اسلامی شمار ہوگا جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو اور انسانیت کو نفع پہنچے۔ بعض احادیث میں علم کو نفلی عبادت پر فضیلت دی گئی ہے:

عن مصعب عن ابيه قال، قال رسول الله ﷺ: فضل العلم أحب إلىّ من فضل العبادة، وخير دينكم الورع. (مستدرک على الصحيحن ، كتاب العلم ۲۷/۳۱۴)

حضرت مصعب اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''میرے نزدیک (حصولِ) علم عبادت کی بہ نسبت بہتر ہے، اور تمھارا بہترین دین تقوی ہے''۔

دوسری حدیث عمرو بن قیسؓ سے مروی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :فضل العلم خير من العبادة وملاک دينكم الورع (مصنف ابن ابى شيبه ،حديث رقم ۳۴۴۰۵)

رسول اللہ نے فرمایا: ''علم کو عبادت پر فضیلت حاصل ہے اور تمھارے دین کی روح تقوی ہے''۔

نیز طلبِ علم کی خاطر نکلنے والے کو مجاہد فی سبیل اللہ کہا گیا ہے:

عن انس بن مالک قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :من خرج فى طلب العلم فهو فى سبيل الله حتى يرجع. (ترمذى، باب فضل طلب العلم حديث رقم ۲۶۴۸ حسن غريب ، ،البيهقى ،حديث رقم ۳۷۱ ،الترغيب فى فضائل الاعمال ،حديث رقم ۲۱۲)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''جو طلبِ علم کی خاطر گھر سے نکلے وہ اللہ کی راہ میں ہے یہاں تک کہ واپس آجائے''۔

میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبے سے وابستہ طلبہ اس بات کے زیادہ اہل ہیں کہ وہ اپنی تعلیم میں کما حقہ توجہ دیں اور دنیا

کے سامنے اس فن میں نئی ایجادات سامنے لائیں اور ممکنہ حد تک سماج کو ان پریشانیوں سے نجات دلانے کی راہ نکالیں جن سے انسان دوچار ہے، ورنہ ان کی غفلت مسلم قوم کو علمی وصنعتی وحرفتی میدان میں مزید پیچھے کرنے کا باعث ہوگی، نیز قسطنطنیہ کی تاریخ کا واقعہ رونما ہونا بعید از ممکن نہیں، جس کا ذکر تُرکی کی تنزل وانحطاط اور علمی پسماندگی کے ذیل میں مولانا علی میاں ندویؒ نے کیا ہے:

''اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دار السلطنت پر ایک غبارہ (Baloon) کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے''۔(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص۱۹۳)

عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دینی تعلیم کے حصول کے لیے یونیورسٹیوں میں موجود تنظیموں کے پروگرام میں شرکت کو لازمی بنائیں۔جس زبان میں باآسانی مطالعہ کرسکتے ہوں اسلامی کتب کا مطالعہ کریں اور ممکنہ حد تک اعمالِ خیر انجام دیں اور شر سے اجتناب کریں۔

ہمارے معاشرے میں عبادت گزار کو دوسری ہی دنیا کا فرد سمجھا جاتا ہے۔شاید اس کی وجہ عابد کی سماج سے لاتعلقی ہی ہے۔ہمارے یہاں جو جتنا زیادہ عبادت گزار ہوتا ہے، وہ اتنا ہی معاشرے سے کٹ کر رہنا چاہتا ہے، یا وہ اپنی عبادت وریاضت کی بقا اور عافیت اسی میں سمجھتا ہے۔شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا:

مست رکھو ذکر وفکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

وہ عبادت ہی کیا جو سماجی حقوق سے بے بہرہ کردے، سماج میں کراہ رہے لوگوں کے درد کو نہ سمجھے، لاتعداد مسائل میں الجھے ہوئے لوگوں کی پریشانیوں کا احساس نہ کرسکے! وہ عبادت ہی کیا جو ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی طاقت اور حوصلہ فراہم نہ کرسکے، اور مظلوم کی دادرسی کا جذبہ پیدا نہ کرے!

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

عبادت کے غیر قرآنی تصور ہی کا نتیجہ ہے کہ جب جنگ کے موقع پر کمر کسنے کی بات ہونی چاہیے، ہتھیار سے مسلح ہونا چاہیے، فوج ترتیب دینی چاہیے، جنگی ساز وسامان کی فراہمی کی فکر ہونی چاہیے، اس وقت دعا ومناجات کی باتیں ہوتی ہیں اور ذکر وفکر کی محفلیں جمتی ہیں۔اس ضمن میں دو وقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، نیز اس سے بات مزید واضح ہوجائے گی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ رقمطراز ہیں:

''اٹھارویں صدی کے اواخر میں نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔علمائے ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی تھی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کردینا چاہیے کہ انجاحِ مقاصد کے لیے تیر بہدف ہے۔چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔لیکن ابھی صحیح بخاری کا ختم، ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کردیا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیرِ بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختمِ خواجگان پڑھا جائے۔ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کررہی تھیں، اِدھر لوگ ختمِ خواجگان کے حلقے میں بیٹھے "یا مقلّب القلوب، یا محول الأحوال" کے نعرے بلند کررہے تھے۔ بالاخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختمِ خواجگان! دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر انہی کو

پہنچاتی ہیں جو عزم وہمت رکھتے ہیں، بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطلِ قوی کا حیلہ بن جاتی ہیں''۔(غبارِ خاطر از مولانا ابوالکلام آزادؒ: ص ۱۶۱،۱۶۲)

معلوم یہ ہوا کہ عبادت یہ نہیں ہے کہ میدانِ جنگ میں لڑنے کے بجائے مسجد میں ذکر وفکر کی محفل جمائی جائے، بلکہ اپنی طرف سے ممکنہ حد تک کوششیں کرنے کے بعد بارگاہِ خداوندی میں عزم وہمت اور فتح وکامرانی کی دعا مانگی جائے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

عبادت کا مقصود رضائے الٰہی

اللہ کی بندگی وغلامی اور اطاعت وفرمانبرداری کی غرض اس کی رضا کا حصول ہو۔ وہ شخص کتنا خوش قسمت ہوگا جس سے اللہ راضی ہو جائے۔ اللہ کی رضا کے حصول کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ جو بھی کارِ خیر کیا جائے اور جس شر سے بھی رکا جائے، وہ صرف اللہ کی خاطر ہو۔ اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ حصولِ ثواب کی نیت بھی باقی نہ رہے، صرف اللہ کی رضا مقصود ہو۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اسی حوالے سے کہا ہے:

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر، جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اللہ کی رضا کے لیے ضروری ہے کہ محبت ونفرت اور لین دین بھی اسی کے لیے ہو۔ حدیثِ نبویؐ ہے:

عن أبي أمامة رضي الله عنه قال :قال رسول الله صلى الله عليه وسلم :من أحب لله وأبغض لله وأعطى لله ومنع لله فقد استكمل الإيمان.(سنن ابی داؤد ،باب الدليل على زيادة الايمان و نقصانه حديث رقم ۴۶۸۱،مصنف ابن ابی شيبه ۳۰۷۳۳)

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی، اور اللہ ہی کے لیے دیا، اور اللہ ہی کے لیے دینے سے باز رہا، اس نے اپنے ایمان کی تکمیل چاہی۔''

عبادت نام ونمود اور ریا سے پاک ہونی چاہیے۔ حدیثِ قدسی ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال :قال الله عزوجل: أنا أغنى الشركاء عن الشرک، فمن عمل لی عملا أشرک فيه غيری فأنا منه بری وهو للذی أشرک. (سنن ابن ماجه، باب الرّيا والسمعة، حديث رقم ۴۲۰۲)

حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ عزوجل کہتا ہے: ''میں تمام شرکاء میں شراکت سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں، تو جس نے میرے لیے کوئی ایسا عمل کیا جس میں کسی دوسرے کو بھی شریک کیا، تو میں اس سے بری ہوں، اور وہ عمل اس کے لیے ہے جس کو اس نے شریک کیا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا: **"إن أخوف ما أخاف عليكم الشرک الأصغر." قالوا: يا رسول الله! وما الشرک الأصغر؟ قال:الرّياء. يقول الله لهم يوم يجازی العباد بأعمالهم: اذهبوا على الذين كنتم تراؤن فی الدنيا، فانظروا هل تجدون عندهم جزاء."(محمود بن لبيدؓ،شرح السنة للبغوی ،باب الرّياء والسمعة ،حديث رقم ۴۱۳۵)**

''مجھے تم پر کسی چیز کا اتنا زیادہ خوف نہیں جتنا شرکِ اصغر کا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''ریاکاری۔ اللہ جس دن بندوں کو جزا دے گا ان لوگوں سے کہے گا جو ریاکاری کرتے تھے: ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو تم دنیا

میں دکھاتے تھے۔دیکھو تمہیں وہاں سے کوئی جزا ملتی ہے"۔

الغرض ہماری عبادت چاہے وہ حقوق اللہ سے متعلق ہو یا حقوق العباد سے اس میں ریاکاری کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیے۔

عبادت کا حسن مخلوق سے محبت

اللہ سے محبت کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس کی مخلوق سے بھی محبت کرے، ان کے دکھ درد میں شریک ہو، ان کی پریشانیوں کو سمجھے، حتی الامکان ان کا مداوا کرنے کی کوشش کرے، لوگوں سے معاملات وتعلقات اچھے رکھے۔حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ نے مریض کی عیادت کرنے، بھوکے کو کھانا کھلانے، پیاسے کو پانی پلانے کو بعینہ ایسے ہی کہا جیسے بندے نے اسے پانی پلایا ہو اور اسے کھلایا ہو۔حدیث حسب ذیل ہے:

عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال :ان الله عزوجل يقول يوم القيامة : يا ابن آدم مرضت فلم تعدنى،قال:يا رب كيف اعودك وانت رب العالمين قال : اما علمت ان عبدى فلانا مرض فلم تعده ، اما علمت انك لو عدته لوجدتنى عنده؟يا ابن آدم استطعمتك فلم تطعمنى قال رب وكيف اطعمك ؟ وانت رب العالمين ،قال اما علمت انه استطعمك عبدى فلان،فلم تطعمه ؟ اماعلمت انك لو اطعمته لوجدت ذلك عندى ، يا ابن آدم استقيتك فلم تسقنى،قال : يارب كيف اسقيك وانت رب العالمين قال :استقاك عبدى فلان فلم تسقه اماانك لوسقيته وجدت ذلك عندى(صحيح مسلم ،باب فضل عيادة المريض، حديث رقم ۲۵۶۹)

حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا:"اے ابنِ آدم! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔وہ کہے گا: اے رب! میں تیری عیادت کیسے کرتا، تو تو رب العالمین ہے۔اللہ کہے گا: کیا تجھے معلوم نہیں میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے وہاں پاتا۔اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا لیکن تو نے مجھے کھلایا نہیں۔بندہ کہے گا: اے رب! میں تجھے کیسے کھلاتا، تو تو سارے جہاں کا پالنہار ہے۔اللہ کہے گا: تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا، لیکن تو نے اسے کھلایا نہیں، اگر تو اسے کھلاتا تو اس کا ثواب میرے پاس پاتا۔اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا، لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔بندہ کہے گا: اے رب! میں تجھے کیسے پانی پلاتا، تو تو سارے عالم کا رب ہے۔اللہ کہے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا، لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا، اگر تو اسے پانی پلاتا تو اس کا بدلہ میرے پاس پاتا۔"

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بندوں کی ضرورت کو پورا کرنا بھی عبادت میں شامل ہے۔

حرفِ آخر: زندگی بے بندگی شرمندگی

عبادت انفرادی واجتماعی زندگی میں خدا کے احکام کو بجالانے کا نام ہے۔عبادت وعابد کے لیے نہ کوئی مخصوص وضع وقطع ہے اور نہ ہی کوئی محدود اوقات ہیں۔عبادت زندگی میں بندگی کا نام ہے۔ازبس ضروری ہے کہ اس تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے خدا کی بندگی کریں، اس سے اپنے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوشش کریں۔ورنہ ایسا نہ ہو کہ اس چند روزہ زندگی میں بے بندگی کی زندگی گزار کر روزِ محشر شرمندہ ہوں۔شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے:

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

والدین اور موجودہ سماج

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی

اسلام کی نظر میں ماں باپ کی خدمت ایک اہم فریضہ ہے : والدین کا احترام اوران کی خدمت اللہ تعالی کی حسن بندگی کے بعد ایک عظیم ذمہ داری اور فریضہ ہے۔اللہ تعالی نے مختلف موقعوں پر جہاں اپنے حق کا ذکر فرمایا ہے اسی جگہ والدین کی اطاعت وخدمت اوران کا شکر بجالانے کی تاکید فرمائی ہے۔نیز رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کوان کے گھریلو حالات کے پیش نظر والدین کی اطاعت وفرماں برداری اوران کی خدمت کو جہاد کے قائم مقام بتایا۔

حضرت ابوھریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا : یارسول اللہ ﷺ ! میرے حسن سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : تیری ماں ۔عرض کیا پھرکون: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: : تیری ماں ۔عرض کیا پھرکون: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: : تیری ماں ۔عرض کیا پھرکون: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیراباپ: (بخاری:۹۱۸)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا: کیا میں جہاد کروں؟ نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: کیاتمہارے والدین بقیدِ حیات ہیں۔انھوں نے جواب دیا: ہاں۔آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں میں جہاد کرو (یعنی ان کی خدمت کرو)'' (بخاری،:۹۱۹)

والدین کو گالی دینا یاگالی دینے کا سبب بننا حرام ہے : نبی کریم ﷺ نے ایک دوسرے کی عزت واحترام کی ترغیب دی اورر بری عادات و اطوار، گالی گلوچ اورخصوصا والدین کوگالی دینے کوفسق و فجور قرار دیا، یااس کا سبب بننا گالی دینے کے مترادف شمارفرمایا، تا کہ ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں آئے جس کا ہرفرد صالح ہو، اس کی زبان صاف ہو، خصوصا والدین کی عزت کا لحاظ رہے، کسی کی بری خصلت یا حرکت والدین کی عزت وآبروکو داغ دارنہ کردے ۔اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین پر لعنت کرے، کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ ! آدمی اپنے ماں باپ پر کس طرح لعنت کرسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی دوسرے کے ماں باپ کوگالی دےتووہ اس کے ماں باپ کوگالی دے گا۔(بخاری:۹۲۰)

والدین کی خدمتوں کا صلہ دنیا میں بھی ملتا ہے : رسول اکرم ﷺ نے نیک کاموں کی ترغیب کی خاطر مختلف سبق آموز واقعات کی روشنی میں

صحابہ کرامؓ کی تربیت فرمائی، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین آدمی چلے جارہے تھے کہ ان کو بارش نے آگھیرا، تو وہ ایک غار میں پناہ کے لیے گئے ۔اس غار کے دہانے پر ایک چٹان آگری، جس سے اس کا منہ بند ہوگیا، تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ تم لوگ اپنے اپنے نیک کاموں پر غور کرو جو تم نے اللہ کے لیے کیے ہیں۔او راس کے واسطے سے اللہ تعالی سے دعا کرو، ممکن ہے اللہ اس چٹان کو ہٹادے، ان میں سے ایک نے کہا: یا اللہ! میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے بچے بھی تھے، میں ان کے لیے جانور چراتا تھا، جب شام کو واپس آتا تو ان جانوروں کا دودھ دوہتا اور اپنے بچوں سے پہلے اپنے والدین کو پلاتا۔ایک دن جنگل میں دور تک چرانے کو لے گیا، واپسی میں شام ہوگئی، جب آیا تو وہ دونوں سو چکے تھے، میں نے حسبِ دستور جانوروں کا دودھ دوہا اور دودھ لے کر سرہانے کھڑا ہوگیا، میں نے نامناسب سمجھا کہ انہیں بیدار کروں اور یہ بھی برا معلوم ہوا کہ میں پہلے اپنے بچوں کو دوں، حالاں کہ بچے میرے قدموں کے پاس آکر رو رہے تھے۔طلوع فجر تک میرا اور میرے بچوں کا یہی حال رہا، اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ صرف تیری رضا کی خاطر کیا ہے تو یہ چٹان ہٹادے ۔تو اللہ تعالی نے اس چٹان کو تھوڑا سا ہٹادیا، یہاں تک کہ آسمان نظر آنے گا، دوسرے آدمی نے کہا: یا اللہ! میری ایک چچازاد بہن تھی، میں اسے بہت چاہتا تھا، اس نے یہ شرط رکھی کہ میں سو دینار لے کر آؤں ۔ چنانچہ میں نے محنت کر کے سو دینار جمع کیے اور اسکے پاس آیا، اور جب میں نے اس کے قریب ہونا چاہا تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے بندے! اللہ سے ڈر اور مہر کو نہ کھول، یہ سن کر میں اس کے پاس ہٹ گیا، یا اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ صرف تیری خوشی کی خاطر کیا ہے تو اس چٹان کو ہٹادے، تو اللہ تعالی نے اس چٹان کو تھوڑا اور سرکادیا۔ تیسرے آدمی نے کہا: یا اللہ! میں نے ایک فرق چاول پر ایک مزدور کام پر لگایا، جب وہ کام پورا کر چکا تو اس نے کہا کہ میرا حق دو، میں نے اس کی مزدوری دے دی، لیکن اس نے اپنی مزدوری چھوڑ دی اور لینے سے انکار کر کے چلا گیا، میں نے اس مزدوری سے مسلسل کاشت کی اور مویشی بھی پالے جو بڑی تعداد میں ہوگئے، ایک دن وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ اللہ سے ڈرو اور مجھ پر ظلم نہ کرو اور مجھے میرا حق دے دو، میں نے کہا: ان مویشیوں اور چرواہے کو لے جاؤ۔ اس نے کہا: اللہ سے ڈرو اور میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں نے کہا: میں تجھ سے مذاق نہیں کر رہا ہوں، یہ جانور اور چرواہا لے جا۔ چنانچہ اس نے لے لیا اور چلا گیا۔اگر تو جانتا ہے کہ یہ میں نے صرف تیری رضا کی خاطر کیا ہے تو باقی چٹان کو بھی ہٹادے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اس کو بھی سرکادیا' (صحیح بخاری، :۹۲۱)

عمر رسیدہ والدین کو کسب معاش پر مجبور کرنا ایک ظلم عظیم ہے، اولاد نہ ہونے کی صورت میں اعزہ واقارب کی ذمہ داری ہے کہ ان عمر رسیدہ افراد کی خدمت کریں، ان کے قیام وطعام کی پوری سہولت فراہم کریں، اخلاقا وشرعا کسی بھی صورت میں ان بزرگوں کو کسب معاش پر مجبور کرنا درست نہیں ہے، حضرت عمرؓ کے دور میں یہ حکم عام تھا کہ ملک کے جس قدر اپاہج افراد ہیں، ان سبھوں کی تنخواہ بیت المال سے مقرر کردی جائے، یہاں تک کہ غیر مسلم سن رسیدہ افراد کا بھی بیت المال سے وظیفہ مقرر تھا، ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک بوڑھے یہودی نابینا کو بھیک مانگتے دیکھا، آپ نے اس شخص سے بھیک مانگنے کا سبب پوچھا، یہودی نے جواب دیا کہ جذیہ اور بوڑھاپا، حضرت عمرؓ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔اپنے گھر لے گئے، اور اتنا کچھ دیا، جو اس وقت کی ضروریات کے لئے کافی تھا، پھر

بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا کہ اس شخص کی طرف اور اس جیسے دوسرے افراد کی طرف توجہ دی جائے، خدا کی قسم، یہ انصاف نہیں کہ ہم اس کی جوانی کی کمائی کھائیں، اور بڑھاپے میں دھتکار دیں، آپ نے ایسے افراد کو جذیہ سے بری قرار دیا، (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، سید قطب شہیدؒ)

اسلام میں سن رسیدہ افراد کا نفقہ اور علاج ومعالجہ ان کی اولاد پر واجب ہے، حتی المقدور اولاد خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں والدین کی خدمت کو شرف سمجھ کر ان کی ہر طرح کی خدمت انجام دیں، ولو بالفرض سن رسیدہ حضرات کی اولاد نہ ہو اور اعزہ واقارب صاحب حیثیت ہوں تو ان لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان کے اخرجات برداشت کریں، خصوصا عصبات کی اہم ذمہ داری ہوگی، الاقرب فالاقرب کے اصول کے تحت معمر افراد کی خدمت واجب ہوگی، پھر ذوی الارحام کی ذمہ داری ہوگی، آخر کار ان رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں یا ان کی عدم استطاعت کی صورت میں بیت المال کے ذریعہ ان کی کفالت کا نظم کیا جائے گا۔

اولاد دراصل والدین کی کمائی اور ان کی قیمتی سرمایہ ہیں، اولاد کی کمائی اور ان کے مال واسباب میں والدین کو پورا پورا شرعی حق حاصل ہے، بوڑھے والدین اگر صاحب حیثیت ہوں پھر بھی زیادہ سہولت حاصل کرنے یا دوسروں پر خرچ کرکے انفاق فی سبیل اللہ کا اجر پانے کی غرض سے یا حفظ ما تقدم کے طور پر کچھ رقم جمع کرنے کی نیت سے اپنی اولاد سے زائد رقم کا مطالبہ کرنے میں شرعا کوئی قباحت نظر نہیں آتی، اس لئے کہ شریعت نے سن رسیدہ/معمر افراد کو اپنی اولاد کی کمائی میں حق کو تسلیم کیا ہے، اولاد اگر خوشی کے ساتھ مالی حقوق ادا کرتی ہے تو بہت اچھی بات ہے، ورنہ والدین کو اپنی اولاد کی کمائی سے ان کی مرضی اور علم کے بغیر بھی لینے کا حق ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا کہ میرے والد نے میرا مال زبردستی لے لیا ہے، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ تو اور تیرا مال تیرے باپ کی ملکیت ہے، مزید فرمایا تمہاری پاکیزہ کمائی تمہاری اولاد ہیں۔ تم ان کے مال میں کھاؤ، پیو، (صحیح ابن ماجہ، عن ابن عمرؓ) لہذا بوڑھے والدین کو ہر حال میں خوش رکھنا اولاد کا حق ہے، محض دنیا کے مال ومتاع کی خاطر والدین کو ناراض کرنا شرعا صحیح نہیں ہے۔

محض زیادہ آمدنی کی خاطر ضعیف والدین کو چھوڑ کر دوسرا شہر یا ملک کا سفر کرنا شرعا صحیح نہیں ہے، نبی کریم ﷺ کی زندگی میں بعض احباب نے جہاد میں شرکت کے لئے اپنا نام مجاہدین کی فہرست میں درج کیا، جب ضعیف والدین نے ان اولاد کے خلاف شکایت کی، اور ان کی ضرورت کے تعلق سے نبی کریم ﷺ سے درخواست پیش کی تو آپ ﷺ نے ان مجاہدین کو جہاد جیسے فریضہ کے مقابلہ میں والدین کی خدمت کے لئے واپس بھیج دیا، حالانکہ اس دور میں ایک ایک مجاہد کی بھی اشد ضرورت تھی۔ (بخاری، ۲۸۴۲)

بہو پر ساس سسر کی خدمت لازم ہے ؟:

بیوی پر اولین حق ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے، اور اسے خوش رکھے، اس کے مال ومتاع کی حفاظت کرے اور اس کے بال بچوں کی حسن تربیت کرے اور ان کی خدمت کرے، اس کی غیر موجودگی میں اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے، اس کے بستر پر کسی اجنبی کو قریب آنے نہ دے، کتاب وسنت کی روشنی میں بہو کی ذمہ داری میں ساس سسر اور اس کے نندوں یا دیوروں کی خدمت واجب نہیں ہے، ساس بہو کا رشتہ کوئی خونی رشتہ بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ بہو کو اپنی ساس کی خدمت ایک بزرگ کی حیثیت سے کرنا ہے، ظاہر ہے کہ ساس عمر میں بڑی ہے اور عموما ضعیف بھی ہوتی ہے،

اس لئے انسانیت کے تقاضے کے تحت ساس اور سسر کی خدمت، ادب واحترام اوران کے راحت کا انتظام کرنا شامل ہے، نیز یہ سوچ کر بھی خدمت کرے یہ میرے شوہر کی خوشی کا باعث ہے، اسی طرح شوہر بھی اپنے ساس وسسر کی خدمت او رحسن سلوک کو لازم سمجھے تو عام طور پر جو جھگڑے ہوتے ہیں، سب کے سب ختم ہوجائیں گے، آپس میں ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کرنے سے دوریاں ختم ہوں گی، الفت ومحبت کا ماحول عام ہوگا، لہذا اخلاقی اعتبار سے یا عرف ومعاشرہ کے اعتبار سے بہو کو چاہیے کہ وہ ساس سسر کی خدمت کرے، شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری کا ایک اخلاقی حصہ سمجھے، البتہ کوئی بہو ساس سسر کی خدمت سے گریزاں ہو تو ایسی صورت میں اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

سماج کے مسائل میں مشترکہ خاندانی نظام بھی ایک مستقل مسئلہ ہے

: اسلامی نقطہ نظر سے جداگانہ اور مشترکہ خاندانی نظام کے ثبوت اور مثالیں عہد نبوت ورسالت اور عہد صحابہؓ سے ہی ملتے ہیں، دونوں نظام زندگی فی نفسہ جائز ودرست ہیں، جس نظام میں شریعت کے حدود وقیود کی پاسداری ہوسکے، والدین اور دیگر افراد خاندان، نیز معذورین کا حق ورعایت ممکن ہوسکے، اس نظام پر عمل بہتر ہوگا، جہاں مشترکہ خاندانی نظام ہو ایک دوسرے کو برداشت کرنا، سب کا لحاظ کرنا، بڑوں کا پاس ولحاظ، چھوٹوں پر شفقت، ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہونا اور مرض والم، رنج وغم میں ڈھال بن کر ساتھ دینا ضروری ہوتا ہے، ہمارے اسلامی معاشرے وتہذیب میں یہ قربانیاں عملا مطلوب ہوتی ہیں، ایسی صورت حال میں بعض عورتیں پریشان ہوکر یا مزاج میں آزادی کی خواہش موجزن ہو تو شوہروں سے مطالبہ کرتی ہیں، کہ چلو ہم الگ گھر بسائیں گے، آزاد رہیں گے، کسی کی ہم پر کوئی حکومت نہ ہو، لیکن شوہر اپنے بوڑھے والدین، جوان بہنوں، اور چھوٹے بھائیوں کو چھوڑ کر الگ گھر بسانا نہیں چاہتا، اور نہ ہی یہ انسانیت کا تقاضا ہے، دوسری طرف بیوی اور اس کے متعلقین کا اصرار اور دباؤ رہتا ہے، نتیجہ کے طور پر یہ سبب طلاق وخلع کا ایک اہم سبب بن جاتا ہے،، حق بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں بھی مشترکہ خاندانی نظام موجود تھا جیسا کہ حضرت جابرؓ نے باکرہ/کنواری کے بجائے ثیبہ (شوہر دیدہ خاتون) سے ہی شادی کی تو آپ ﷺ نے وجہ دریافت فرمائی تو اس کا جواب یہی بتایا کہ میری بہنیں ہیں، ان کی تعلیم وتربیت اور ادب سکھانے کے لئے ہمارے گھر کے لئے ثیبہ (شوہر دیدہ عورت) ہی بہتر ہے، حالات وضروریات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، خصوصا جہاں مشترکہ نظام ہو یہ اس وقت تک کامیاب نظام ہے جب تک کہ افراد میں ایثار، ہمدردی، تحمل اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت موجود ہو، ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کرنے کی قوت ہو اور گھر کے سرپرست حضرات عدل وانصاف کو سامنے رکھیں، کسی کو کسی پر بلاضرورت فوقیت نہ دیں، کسب معاش میں بعض افراد خاندان کا دوسروں کے بالمقابل کم یا زیادہ ہونا اور اسی کی بنیاد پر تفریق کرنا وغیرہ اس نظام کو پارہ پارہ کردیتے ہیں، اس نظام کو چلانے میں سرپرستوں میں عدل وانصاف کا بدرجہ اتم پایا جانا بہت ضروری ہے ورنہ خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا، سرپرست حضرات کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ حالات کے مطابق فیصلہ کریں، اگر عافیت اس میں ہے کہ جداگانہ نظام پر عمل ہی بہتر ہو تو فورا اس پر عمل کیا جائے، خواہ مخواہ کی ضد اچھی چیز نہیں، بعض والدین کا بے جا اصرار ہوتا ہے کہ ہماری زندگی تک ہمارے بچے ہر حال میں ہمارے

ساتھ ہی رہیں، پھر ہماری وفات کے بعد اولاد کی مرضی ہے، خواہ مل جل کر رہیں، یا جداگانہ نظام پر عمل کرسکیں، اس سے بہتر صورت تو یہی ہے کہ سرپرست بروقت صحیح فیصلہ کریں، عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں، جو مناسب ہو حکمت عملی کا ثبوت دے کر اولاد کی صحیح رہنمائی کریں، واللہ ہو الموفق، (تفصیلات کے لئے۔فقہ اسلامی، ص ۱۲۴)

اس سلسلہ میں بیسویں فقہی سمینار، اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا میں یہ تجویز طے کی گئی تھی کہ والدین کی خدمت وکفالت لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں پر بھی حسب استطاعت واجب ہے، اگر ماں کو ایسی خدمت کی ضرورت ہو جس کو کوئی عورت ہی انجام دے سکتی ہو اور بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو نیز ماں مجبور ہو خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی، (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص ۱۲۵)

کیا اولاد کو والدین کے نکاح ثانی میں رکاوٹ بننے کا حق ہے ؟: والد صحت وتندرستی کی حالت میں ہو اور اسے شادی کی ضرورت ہو تو اولاد کو شرعا والد کی شادی میں رکاوٹ بننے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، عہد سلف میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں باپ نے نکاح ثانی کیا یا نکاح ثالث کیا، مگر اس میں اولاد کو کوئی رکاوٹ نہ تھی، نیز والد کی خدمت کے لئے کوئی اولاد نہ ہو، ہر ایک اپنی زندگی میں مگن ہو، عمر رسیدہ باپ کی خدمت کے لئے کوئی تیار نہ ہو تو ایسی صورتِ حال میں باپ اگر شادی کرنا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا، الا یہ کہ اولاد اگر خدمت کے لئے ہر صورت میں تیار ہو، باپ عمر رسیدہ ہو خواہ مخواہ شادی کی ضد کر رہا ہو، یا وارثین کو وراثت کے مال میں نقصان پہنچانا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں باپ کے لئے نکاح ثانی کا ارادہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

ولو بالفرض باپ حسب ضرورت ومصلحت نکاح ثانی کرلے تو اولاد پر سوتیلی ماں کی عزت واحترام واجب ہے، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، صلہ رحمی کرنا، ان کے رشتوں کی عزت واحترام بھی ملحوظ رکھنا واجب ہے، نیز باپ کے حق کے ساتھ سوتیلی ماں کے حق کا لحاظ رکھنا اولاد پر واجب ہوگا، چونکہ باپ کی بیوی بھی ماں کا درجہ رکھتی ہے، نیز والد کے انتقال یا طلاق یا خلع کی صورت میں ماں کو بھی شرعا حق ہے کہ وہ اگر چاہے تو نکاح ثانی کرلے، اولاد کی اجازت یا رضامندی وغیرہ کی شرعا کوئی حیثیت نہیں ہے۔

کیا اولاد والدین کی زندگی میں ہی جائداد کا مطالبہ کرسکتی ہے ؟ والدین اپنی جائداد کے مالک ہیں لہذا ان کا حسب ضرورت ومصلحت تصرف کرنا درست ہے البتہ زندگی میں جائیداد کی تقسیم کے لئے دو شرعی صورتیں ممکن ہیں ا۔مساویانہ تقسیم ۲۔لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دینا۔ البتہ زندگی میں ہبہ کرنیکی صورت میں کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنے کی نیت ہرگز نہ ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انما الأعمال بالنیات (بخاری) یعنی اعمال کی قبولیت کا دارومدار نیتوں پر موقوف ہے، اولاد کو شرعا یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ماں باپ کے زندہ رہتے ہوئے ان کی جائداد میں حصوں کا مطالبہ کریں، البتہ ان کی وفات کے بعد اگر کچھ مال رہ جاتا ہے تو بشکل ترکہ تقسیم ہوگا ورنہ نہیں، لہذا اولاد کا کسی بھی صورت میں والدین سے جائداد کی تقسیم کا مطالبہ درست نہیں ہے، خواہ اولاد محتاج ہوں یا نہ ہوں، بلکہ اولاد کا یہ مطالبہ گستاخی پر محمول ہوگا، نیز ہندوانہ رسم ورواج میں شمار ہوگا جو کسی بھی صورت میں مسلمان کے لئے زیب نہیں دیتا۔

بوڑھوں کے لئے بنائے گئے ہاسٹل کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کیا ہے ؟: کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرسکتا ہے؟

والدین خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اسلام ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اور ادائیگیِ حقوق کی ترغیب دیتا ہے، البتہ شرک کے معاملات میں ان کی اطاعت کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اصولی مسائل الگ ہیں اور حسنِ معاشرت اور حقوق کی ادائیگی الگ چیز ہے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئی جو مسلمان نہیں ہوئی تھی، میں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں ان سے صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ ابن عیینہؒ کا بیان ہے کہ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ.. (الممتحنہ:۸) یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں جنگ نہیں کرتے''۔ (صحیح بخاری :۹۲۵)

ضعیف والدین کی خدمت اسلام میں واجب ہے، بلکہ حقوق اللہ کے بعد اولین حق والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، تادم حیات ان کی اطاعت کرنا، انہیں اف تک نہ کہنا، ان کی زندگی میں ان کے حق میں دعا کرتے رہنا اور ان کی وفات کے بعد ان کے حق میں دعاء مغفرت کرنا، اور ان کے دوست واحباب کی عزت کرنا، جیسا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے تعلق سے احکامات وارد ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا. (سورۃ الاسراء:۲۳.۲۴) ترجمہ . اور تیرا رب صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا یہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ کہنا، نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا، بلکہ ان کے ساتھ ادب واحترام سے بات چیت کرنا۔ اور عجز و نیاز سے اُن کے آگے جھکے رہو اور اُن کے حق میں دعا کرو کہ اے اللہ! جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پرورش کیا ہے تو بھی اُن (کے حال) پر رحم فرما۔

دور جدید میں مغربی تہذیب نے انسانی اقدار کو پامال کیا، OLD AGE HOME جگہ جگہ بنادئے، ضعیف ماں باپ کے قیام کے لئے الگ الگ عمارتیں بنوائیں، والدین کو اپنے گھروں سے دور کردیا، اولاد کی محبت سے جدا کردیا، سماج کے معزز شہریوں کو سماج کا عضو معطل بنادیا، لیکن یہ مغربی تہذیب کی تباہ کاریاں ہیں، اسی تہذیب نے انسان کو انسانیت سے محروم کردیا، جب کہ اسلام نے والدین کو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے اونچا مقام دیا، تادم حیات ان کی خدمت کو واجب قرار دیا، ان کی زندگی کے بعد بھی ان کی مغفرت کی دعا کرنا، انکے چھوڑے ہوئے روزوں کو قضا کرنا، ان کی جائز وصیتوں کو نافذ کرنا، اولاد اگر مستطیع ہو تو والدین کی طرف سے حج کریں، اور انہیں ثواب پہنچائیں، صدقہ جاریہ کا انتظام کریں، تاکہ ان کی وفات کے بعد ثواب ملتا رہے، یہ سارے کام بھی صالح اولاد کی ذمہ داریوں میں سے ہیں، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ (احمد، نسائی) اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے

اور اللہ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔ (الادب المفرد للبخاری : ۱/۱۴)

والدین کی اطاعت وفرمانبرداری ہر حال میں فرض ہے الا یہ کہ ان کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو تو اللہ تعالی کو ناراض کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، مثال کے طور پر والدین شرک پر مجبور کریں، احکام اسلام کی مخالفت کا حکم دیں، یا شرکیہ امور کی طرف دعوت دیں، یا بدعات وخرافات کی ترغیب دیں، اسلام کے خلاف رسم رواج کو اہمیت دیں، یا ناحق بیوی بچوں پر ظلم کرنے پر آمادہ کریں تو ایسی صورت میں اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہی واجب ہوگی، خواہ سماج کچھ بھی سوچے، کچھ بھی الزام لگائے، رب کی رضامندی ہر چیز پر مقدم ہوگی۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ایمان لانے کی خبر سے ان کی والدہ ناراض ہوگئی تھیں، کھانا پینا سب بند کر دیا تھا، دو دن گزر گئے تھے مگر حضرت سعد نے فرمایا کہ اے ماں اگر تمہاری ایک جان کے بجائے سو جان بھی چلی جائے پھر بھی میں رب کو ناراض نہیں کروں گا، اسلام کے مقابلہ میں شرک کو قبول نہیں کروں گا۔ (تفسیر صفوۃ التفاسیر: ۲/ ۴۱۵)

خصوصاً آج کے دور میں ضعیف والدین کا پرسان حال کوئی نہیں ہے الا ماشاء اللہ، والدین کو ترسا کر اولاد اپنی دنیا میں مگن ہیں، اپنی خوشی کی خاطر، اپنی راحت کے لئے بوڑھے والدین کو بوجھ سمجھنا انتہائی بداخلاقی کی بات ہے، وہ شخص خوش نصیب ہے جو تادم حیات ان کی خدمت کرے، ان سے دعائیں لے، اور ان کے حق میں دعا بھی کرے، وفات کے بعد بھی انہیں دعاء خیر میں یاد رکھے، اللہ تعالی ہم سب کو اسلامی تعلیمات کے مطابق والدین کی قدر دانی کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

اولڈ ایج ہوسٹل اور مجبور وبے کس والدین : اولاد کا حق ہے کہ اپنے والدین کی خدمت کریں، ان کے رہن سہن کا انتظام کریں، جہاں اولاد کا قیام ہے اسی جگہ اپنے والدین کے لئے بھی قیام کا انتظام کریں، والدین کو ان ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا شرعا جائز نہیں ہے، بلکہ وہ عند اللہ بڑا مجرم شمار ہوگا، کیونکہ والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم شریعت میں واجب کے درجہ میں ہے، لہذا کوئی بھی نیک اولاد اپنے بزرگوں کو اپنے گھروں کے ہوتے ہوئے ان ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور نہیں کر سکتا، اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو مسلم معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ایسے افراد کی سرزنش کرے، ان کی تنبیہ کرے، اور انہیں مجبور کرے کہ وہ معمر افراد کے ساتھ زیادتی نہ کرے، ان ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور نہ کرے۔

اولڈ ایج ہاسٹل (OLD AGE HOSTEL) جو بنائے جاتے ہیں ان کی حیثیت صرف اور صرف اضطراری صورت میں جواز کی ہوسکتی ہے، مثلا جن کا سماج میں کوئی پرسان حال نہ ہو، یعنی اصحابِ فرائض، عصبات اور ذوی الارحام میں سے کوئی بھی ان ضعیفوں کی دیکھ ریکھ کے لئے تیار نہ ہو تو مسلم معاشرہ/ بیت المال/ جمعیت یا جماعت کی زیر نگرانی اس ہاسٹل میں قیام ممکن ہے تاکہ ان ضعفاء کے لئے در بہ در کی ٹھوکریں کھانے کی نوبت نہ آئے، اور عمر رسیدہ حضرات ایک ہی جگہ محفوظ رہ سکیں، اور عزت کی زندگی گذار سکیں، انہیں بھیک مانگنے کی نوبت نہ آئے، ایسی صورت میں مجبور ان بے کسوں کے لئے یہ ہاسٹل بہتر ہیں، واللہ ولی التوفیق، وصلی اللہ علی نبینا محمد وبارک وسلم۔ والحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆

فکر اسلامی

(قسط-۲)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نوٹ: افادیت کے پیش نظر اس کتاب کی قسط وار اشاعت شروع کی گئی، اب یہ مقدمۂ کتاب کی دوسری قسط حاضر ہے، اسی دوران یہ اطلاع ملی جو قارئین کے لیے یقینا باعث مسرت ہوگی کہ یہ کتاب پاکستان میں بھی شائع ہو گئی ہے۔ (ادارہ)

حضرت مولانا کے سلسلہ میں یہ کہا جانا انتہائی غلط ہے کہ وہ کسی منکر کی تردید نہ کرتے تھے اور کسی تنظیم یا فرقہ پر تنقید نہ کرتے تھے، مولانا کی جرأت گفتار اور دینی غیرت وحمیت ہی ان کی تحریر وتقریر کا اصل جوہر ہے، مولانا نے بہت واضح تنقیدیں کی ہیں، عربوں کی بے راہ روی، عیش وعشرت پسندی، مادیت پرستی، حقیقی اسلام سے بُعد تقریبا آپ کے ہر عربی مضمون وخطاب کا حصہ رہا ہے، ہندوستان میں صحیح وغلط موقف کی وضاحت میں آپ نے اپنے قلم وزبان کو ہمیشہ استعمال کیا ہے، آپ کے رسالہ احاديث صريحة مع اخواننا العرب اور سلسلہ إسمعيات آپ کی تنقیدوں اور صحیح تعبیر میں اصلاح کی غرض سے کی گئی تنقیدوں کا مجموعہ ہے، ملک و بیرون ملک کے کسی مسئلہ میں بھی مولانا مجاملت و مداہنت سے کام نہیں لیتے تھے، موقع پڑا تو اتحاد کی علامت سمجھے جانے والے اس داعی حق کو ''دو متضاد تصویریں'' لکھنے سے بھی کوئی امر مانع نہ رہا، وہ آوازۂ حق نہایت شان وصراحت سے بلند کیا کرتے تھے، مولانا کا رسالہ من الجباية إلى الهداية مولانا کی دینی غیرت اور منہج نقد واصلاح کا غماز ہے، یہ رسالہ درحقیقت مولانا کے ان ہی جذبات کا عکاس ہے جن کا اظہار انہوں نے اپنے سفر حجاز ۱۹۵۰ء میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلیؒ صاحب کے نام لکھے گئے خط میں کیا ہے، اس رسالہ میں مولانا نے جن امراض کی نشاندہی کی اور جن کوتاہیوں اور برائیوں کو اجاگر کیا وہ ختم نہ ہوئیں بلکہ دن بدن بڑھتی گئیں اور مولانا تھے کہ آخر تک منکر کی نکیر کرتے رہے، رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں بسا اوقات حضرت مولانا اپنا دل نکال کر رکھ دیا کرتے تھے، اور زبان دل سے گفتگو کیا کرتے تھے، لیکن ان لوگوں پر کیا اثر ہوتا جنہوں نے ایک نیک انسان کے مخلص جذبات کے تحت ۱۹۶۲ء میں وجود آنے والی اس تنظیم کو محض اپنا ترجمان بنالیا اور ہمیشہ اس تنظیم کا استحصال کیا، حد یہ کہ جو شخص اس کا فکری مؤسس تھا اس کو چند سال کے بعد اس کی حق بیانی اور صاف گوئی کے سبب ایسا معتوب قرار دیا کہ آخری عمر یعنی ۱۹۹۵ء تک ان کا حجاز آنا جانا موقوف رہا، بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگا کہ رابطہ عالم اسلامی کے فکری مؤسس شیخ حسن البناء کے داماد ومعتمدِ خاص ڈاکٹر سعید رمضانؒ تھے اور ان ہی کی دعوت پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

حضرت مولاناؒ حق گوئی میں ایک لحظہ بھی چوکتے نہ تھے، بلکہ بروقت جواب دے دیا کرتے تھے، مولانا نے خود بیان کیا کہ ان کا رسالہ "ردة ولا أبا بكر لها" بہت عام ہوا اور خوب پڑھا گیا، رابطہ عالم اسلامی کے جلسہ میں وہ تشریف رکھتے تھے

کہ خمینی صاحب داخل ہوئے تو مفتی امین الحسینیؒ نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، پھر مولانا کو ان سے متعارف کرایا، تو خمینی صاحب گویا ہوئے، جی آپ کا رسالہ ردة ولا ابا بكر لها پڑھا ہے لیکن اس کا نام ردة ولا ابا حسن لها ہونا چاہیے تھا، خمینی صاحب نے اپنی روایتی عداوت اور عقیدے کی ترجمانی کردی، لیکن مولانا کی ظرافت وحق گوئی نے ان کو یوں خاموش کیا کہ یہ تو ایسے ہی ٹھیک ہے، عربی محاورہ "قضية ولا أبا حسن لها ہے،

ڈاکٹر حسن الأمرانی نے اپنے ایک مقالہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "شیخ ابوالحسن نے خود مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ خمینی صاحب میرے ساتھ خانۂ کعبہ کا طواف کررہے تھے اور دعا یو ں پڑھتے تھے ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان یہاں پہنچ کر رک جاتے اور آیت نہ پوری کرتے پھر اسی کو دوہراتے، تو میں ان سے قریب ہوا اور کہا "ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذين آمنوا" شیخ نے فرمایا کہ گویا میں نے ان کو کچوکہ لگایا"۔

یہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ یہ صرف میرا احساس نہیں کہ مولانا کی دعوت اور ان کے دینی جذبات سے جن لوگوں کو ہوش کے ناخن لینا چاہیے تھا انہوں نے نہ لیا، البتہ ایسا بھی نہیں کہ اس کا اثر نہ ہوا لیکن حکومتی سطح پر وہ نہ ہوا جس کی خود حضرت مولانا کو امید تھی، من الجبايه الى الهداية جو ابتداءً ایک خط تھا، اسکو مولانا نے مولانا عبیداللہ صاحب کے حوالے کیا، انہوں نے شیخ عمر بن الحسن کو پہنچا دیا کہ وہ مملکت سعودیہ کے ولی عہد کو پڑھ کر سنادیں، مولانا یہ لکھنے کے بعد کہ معلوم ہوا کہ وہ انہوں نے سنا دیا یوں افسوس وحسرت کا اظہار کرتے ہیں:

"کاش! کہ اس خط کا کوئی عملی نتیجہ نکلتا، اور اسی وقت سے راستہ کی تبدیلی کی کوشش کی جاتی تو آج نہ صرف مملکت سعودیہ بلکہ عالم اسلام کی صورت حال بہت مختلف ہوتی" (کاروان زندگی ج ا ص ۳۴۱)

مولانا کا ملی جذبہ اور دینی غیرت وحمیت "عرب قومیت" کے خلاف تحریک چلانے میں بھی قابل دید ولائق تقلید ہے، اس وقت مولانا پر اس فتنہ کی تنقید کا ایسا غلبہ تھا کہ جو لوگ مولانا اور ان کے خاندان کے مزاج سے واقف تھے وہ کہتے تھے ان کو کیا ہوگیا ہے، مولانا نے ایسی جرأت مندانہ تنقید کی کہ حکومت مصر کی شکایت پر حکومت ہند نے استفسار تک کیا، کہا جاسکتا ہے کہ عرب قومیت کے باطل نظریہ کے خلاف سب سے طاقتور آواز ہندوستان سے ہی بلند ہوئی، یہی نہیں بلکہ عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی ذلت آمیز شکست کا مولانا نے بے لاگ تجزیہ کیا ہے اور اس ضمن میں مولانا نے جزیرۃ العرب میں بیٹھ کر عربوں پر سخت تنقیدیں کی ہیں، اس سلسلہ کے مضامین کا مجموعہ "عالم عربی کا المیہ" حقائق کے انکشاف، حالات کا مومنانہ تجزیہ اور صاف گوئی کی جرأت پر دلالت کرتا ہے، مولانا نے اس وقت عربوں کی شکست کے جن اسباب کی نشاندہی کی وہ آج عربوں میں پہلے سے کئی سو فیصد زیادہ ترقی کر گئے ہیں، آپسی انتشار، مادیت پسندی، اقتدار کی حفاظت، اسلام سے دوری اور اسلام پسند لوگوں سے نفرت وعداوت نے انکو امریکہ کا غلام اور اسرائیل کا نمائندہ بنا دیا ہے، طبعی اور دینی واخلاقی دونوں نظامہائے زندگی سے ان کی بغاوت عروج پر پہنچ گئی ہے، اسرائیل سے جنگ کے موقع پر بقول مفکر اسلامؒ "ان پر بے چینی واضطرار طاری رہتا اور وہ اپنے اوپر اللہ کی مباح کردہ لذتیں بھی حرام کر لیتے" لیکن اب تو بات یہاں تک آپہنچی ہیکہ وہ ان ہی لذتوں کے لئے جیتے ہیں، بلکہ ان ہی اسباب تلذذ کی حفاظت کے لئے انہوں نے دین کو امریکہ واسرائیل کی پسند کے مطابق بقدر ضرورت استعمال کرنے اور اسکا پروپیگنڈہ کرنے تک محدود کر دیا ہے، اسلامی ممالک اغیار کے دست نگر

بنا دیے گئے ہیں، دینی شعائر پر پابندیاں عائد کی جارہی ہیں! بے حیائی وفحاشی اور عریانیت ولذت کوشی نے ان کو اپنے شکنجہ ضلالت میں گرفتار کر کے دین کے نور بصیرت سے ہزاروں کوس دور کر دیا ہے، مدینہ طیبہ میں جوار مسجد نبوی میں مولانا کی یہ حق گوئی ملاحظہ کیجئے:

''صرف زمانۂ جنگ اور اس سے چند دن قبل کے اخبارات ورسائل پڑھئے کیا یہ اخلاق اور یہ طریقۂ زندگی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا موجب ہوسکتا ہے؟ کیا ام کلثوم کے گیت اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی رضا اور فتح وکامرانی کے نزول کا ذریعہ بن سکتے ہیں؟ کیا یہ نائٹ کلب، عریانی وبے حیائی کے اڈے، جسے ہمارے بھائیوں نے اس ملک میں نئی زندگی بخشی جس پر مقدس اسلامی مقامات کے دفاع کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ہمیں رسوائی وہزیمت سے بچا سکتے ہیں؟'' (عالم عربی کا المیہ ص ۷۸/۷۹)

مولاناؒ نے ایک طرف مغربی تہذیب پر تنقید کی تو دوسری طرف امت اسلامیہ کو اپنی تہذیب پر فخر کرنے کی دعوت دی، اسلامی تمدن کو اختیار کرنے پر ہر جگہ زور دیا، تعلیم، نظام تعلیم اور نصاب تعلیم پر اپنی قیمتی آراء پیش کیں، نظام تعلیم کو اسلامی بنانے اور نصاب میں دینی عنصر داخل کرنے کی تاکید کی، نصاب میں تجدید واصلاح کی رائے دی، مولانا درحقیقت مفکر تھے، وقت کے تقاضے پیش نظر رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر کے مفکرین میں مولانا منفرد ہیں، جن کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ علم میں دوئی کا کوئی تصور نہیں، یہ کہہ کر گویا انہوں نے ایک بہت بڑے انقلاب کی دعوت دی، ملی مسائل میں بڑھ کر حصہ لینے کے ساتھ علماء کو حالات سے جڑنے کی بھرپور و مؤثر دعوت دی، موقع پڑا تو شیعیت وقادیانیت کی تردید میں سارا زور صرف کر دیا، وسیع النظری اور وسعت فکری کا یہ مطلب سمجھنا مولانا کے نزدیک قطعی درست نہ تھا کہ حق کو حق اور باطل کو باطل نہ کہا جائے، وہ اس کو دعوت اتحاد کے منافی بھی نہ سمجھتے تھے بلکہ جب ''دو متضاد تصویریں'' کی تصنیف پر بعض اہل تعلق نے اعتراض کیا تو مولانا نے اس کو زندگی بھر کا سرمایہ اور باعث نجات قرار دیا اور اس کو علماء ربانیین ومجددین کا طریقہ قرار دیا، مولانا کی غیرت ایمانی انکی جرأت گفتار کو ہمیشہ رواں دواں رکھتی تھی، وہ باطل کی زیادتیوں پر مضطرب ہو جایا کرتے تھے اور یہ جذبات پھر زبان وقلم سے سیل رواں کی طرح جاری ہو جایا کرتے تھے اور عبارت کو جوش وغیرت سے معمور کر دیا کرتے تھے، دعوتِ اتحاد اپنی جگہ، جادۂ اعتدال کی پاسداری کا اپنا مقام لیکن مفکر وہی ہے جو موضوع اور وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے مسائل کو پوری جرأت کے ساتھ بیان کرے، ''سیرت سید احمد شہید'' میں مولانا کا جو رنگ ہے وہ تادم آخر باقی رہا، اگر آج بھی حضرت والا بقید حیات ہوتے تو انکا قلم مجاہد کی تلوار کی طرح چلتا اور خون ناحق بہانے والوں پر انکی زبان دنیا بھر کو متوجہ کر دینے کیلئے کافی ہوتی، جو خون ناحق بہایا گیا اور جس طرح علماء کے ایک گروہ نے حق کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی اور مظلوم وامن پسند اور اسلام پسند مظاہرین کو بھیانک تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد مفسد ودہشت گرد قرار دیا گیا، اے کاش کہ یہ متحمس وغیرت منداور مومن قلم زندہ ومتحرک ہوتا تو پوری دنیا میں اہل حق کے محاذ کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا، نفوس قدسیہ کے دفاع اور مظلوموں کی حمایت کا یہ غیرت سے لبریز رنگ دیکھئے، سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک طبقہ مجاہد اسلام حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کو کافر وگمراہ ثابت کرتا ہے، اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے مولاناؒ کے قلم سے جو جملے نکلے ہیں وہ ہمارے لیئے دفاع حق کا نمونہ اور اعتدال وغیرت ایمانی سے مرکب ایک حسین تصویر ہیں، مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

''مولانا کی دوسری فضیلتیں تو رہیں برطرف، انکی شہادت

مسلم ہے اور شہداء کی مغفرت مسلم ،لیکن ۲۴؍ذو القعدہ ۱۲۴۸ھ سے لیکر آج تک کم وبیش ۱۳۶ برس کے طویل عرصہ میں شاید ہی کوئی ایسا دن طلوع ہوا ہو، جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی تکفیر وتضلیل کا کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو،لعنت اور سب وشتم کا کوئی صیغہ استعمال نہ کیا گیا ہو، فقہ وفتاوی کی کوئی دلیل ایسی نہیں، جو اس کے کفر کے ثبوت میں پیش نہ کی گئی ہو، وہ ابوجہل وابولہب سے زیادہ دشمن اسلام، خوارج مرتدین سے زیادہ مارق من الدین وخارج از اسلام، فرعون وھامان سے زیادہ مستحق نار، کفر وضلالت کا بانی، بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد وشاگرد بتایا گیا، یہ ان لوگوں نے کہا، جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لئے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو خون چھوڑ کر (کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر؟) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی! یہ ان لوگوں نے کہا، جن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت وعصمت بچانے کے لئے اس نے سر کٹایا، کیا اس کا یہی گناہ تھا، اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین وایمان، جان ومال، عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، سکھ اپنے گھروں مسلمان عورتیں ڈال لیتے تھے، مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی، اور ان میں گھوڑے باندھے جاتے تھے، اس وقت یہ غیرت وایمانی حمیت اسلامی کے مدعی کہاں تھے؟

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے"

(سیرت سید احمد شہید ج ۲ ص ۴۸۶-۴۸۷)

مولانا کی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، باطل ادبی نظریات کے مقابلہ کیلئے اسلامی نظریہ ادب جو پہلے سے کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا اس کو ایک مستقل ادبی اسکول کی شکل دینے کا تجدیدی کارنامہ انجام دیا، ندوۃ العلماء کے سبزہ زار کو کئی مرتبہ عرب وعجم کے علماء اور عمائدین کے اجتماع سے معمور ومنور کیا، امت اور بالخصوص اس کے مثقف طبقہ نیز امراء وحکام کی فکری رہنمائی کی کوشش کی، دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت کے ساتھ عصری تعلیم کو ایمان واخلاقیات سے مربوط کرنے کی کوشش کی، عصری اور بالخصوص ملی دانش گاہوں کو ان کے فرائض و واجبات یاد دلائے، دینی تعلیمی تحریک کی صدارت کی، اصلاح نصاب کی آواز بلند کی، تعلیم کے وسائل کو سراہا، خود مؤثر نصابی کتابیں تیار کیں، مدارس ویونیورسٹیز کو علحدہ علحدہ اپنی ذمہ داریاں یاد دلائیں، مولاناؒ کو اس کا سخت احساس تھا کہ جس طبقہ میں دین ہے وہ اقتدار سنبھالنے سے قاصر ہے اور جس طبقہ کے ہاتھ میں نظام حکومت اور کم از کم نظام تعلیم آتا ہے وہ دین سے دور ہے، اس کے سبب معاشرہ جس تضاد کا شکار ہوتا ہے اس سے کرب وبے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت اور ٹکراؤ کی حالت پیدا ہوجانا ناگزیر ہے، مولانا نے دیندار طبقہ کو مشورہ دیا اور خود انتھک محنت کی کہ اس طبقہ تک دین پہنچایا جائے اور اس کو اسلامی اخلاقیات سے متصف کیا جائے۔

مولانا کی ذات بے شمار خوشنما خوبیوں کا حسین مرقع تھی، ان کی خدمات نہایت وقیع اور سنجیدہ وبے لوث تھیں، ان کو اخلاص کی جو دولت نصیب ہوئی تھی اور روح کی جو پاکیزگی میسر تھی اس کے سبب لوگوں کو بے انتہا متاثر کرتے تھے، لوگ ان کے ہمنوا ہوجاتے تھے، کارآمد افراد کی ناز برداری کا ہنر مولانا جانتے تھے بلکہ مخالفین کو بھی ملت کے کام کا بنا لیتے تھے، رعایت ومروت مولانا کا خاص وصف تھا، لوگوں کو جوڑنے اور ان سے کام لینے کی حکمت معلوم تھی، آج بہت سے افراد کارآمد ہیں، لیکن افسوس کہ قحط الرجال کا شکوہ ہے، لیکن کارآمد لوگوں کو استعمال کرنے کا ہنر گویا

معدوم ہو چکا ہے، اور افراد سازی تو تقریبا مفقود ہے، بے کار لوگوں کو کار آمد بنانا تو دور قریب آئے ہوئے لوگوں کو جوڑ کر رکھنے کا وصف بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن حضرت مولاناؒ کی زندگی ان خوبیوں سے عبارت تھی اسی لیے انہیں جاں نثاروں اور لائق و فائق افراد کار کی ایک جماعت ہاتھ آ گئی تھی، اسمیں ان کی فراخ دلی، بے لوثی، ذاتی اور خاندانی مفادات سے آخری درجہ کی دوری، وسعت قلبی، دور اندیشی، متفکرانہ مزاج، دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، طبیعت کی شرافت، دسروں کا اعتراف، بڑوں کے احترام کے ساتھ معاصرین کی عزت افزائی اور چھوٹوں کی دلجوئی کو بڑا دخل تھا، ظاہر ہے کہ ان تمام خصوصیات پر الگ الگ مقالات لکھے جا سکتے ہیں مگر یہاں سوانح لکھنا اور مولانا کی شخصیت و خدمات کا احاطہ کرنا مقصد نہیں ہے، مولانا کی پوری زندگی اس سے عبارت ہے کہ ؎

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اگر ان لوگوں کی روایات اور واقعات کو بہت احتیاط کے ساتھ جمع کیا جائے تو بھی الگ ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے جن کو حضرت مولانا نے ان کی صلاحیت و حیثیت کے اعتبار سے استعمال کیا، وہ بہت بڑے بڑے کام لوگوں سے لیا کرتے تھے اور ان کو آگے بڑھایا کرتے تھے، ان کی مدد کرتے اور انہیں ملت کے لئے استعمال کرتے، اسمیں مولانا کی فردشناسی کے ساتھ ان کے انقلابی مزاج و حرکیت اور ملی تڑپ کو بڑا دخل تھا،

بس چلتے چلتے یہ اور عرض کرنے کا دل چاہتا ہیکہ مولانا کو عنداللہ جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا پرتو دنیا میں یوں نظر آیا کہ وہ خلق خدا میں بے پناہ مقبول ہوئے، انکو اہل دل کی دعائیں ملیں، اہل علم کی نظر میں قدر و منزلت حاصل ہوئی، ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کو وہ نفوس ملے جنہوں نے اپنی زندگیاں آپ پر نثار کر دیں، مخلص و دور اندیش اور متحرک رفقاء کار کا ہاتھ آنا بھی بڑی نعمت ہے، مولانا کو ایسے مخلصین ملے کہ جو آپ کے علمی و فکری معاون ہونے کے ساتھ ساتھ ملی کاموں، ملک و بیرون ملک کے دعوتی دوروں اور اسفار کے اچھے مشیر و معاون رہے، کیا ہی خوب ہو کہ کوئی صاحب قلم اس پہلو پر بھی ایک دلآویز کتاب پیش کر دے تا کہ اس دور آخر میں ایثار کرنے والے مخلصین کا بھی ایک پر کشش مجموعہ منظر عام پر آ کر لوگوں کے لئے قابل تقلید ثابت ہو سکے، کہ اب تو ایثار و اخلاص عنقاء ہوئے جاتے ہیں اور ہر کس و ناکس مشیر و معاون بنا جاتا ہے، جس کے سبب عمل اور تحریک عمل کا متاثر ہونا یقینی ہے، مفاد پرستی جس قدر بڑھ گئی ہے افراد شناسی اسی قدر مفقود ہے،

گفتگو طویل ہو گئی حالانکہ اس کتاب کو ضخامت سے بچا کر محض ایک نمونہ فکر و عمل کے طور پر پیش کرنا تھا، اسمیں مختلف موضوعات کے اقتباسات بالخصوص ''کاروان زندگی'' سے لیے گئے ہیں اور ماقبل و مابعد کی سطروں کے ذریعہ موجودہ دور میں ان کی معنویت و اہمیت واضح کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے، اقتباسات کی مناسبت سے ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں، ملی تڑپ، جدوجہد میں تسلسل و اخلاص، حرکیت و جامعیت اور استغناء و بے لوثی کی حسین تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک طویل اقتباس مولانا عبداللہ عباسؒ صاحب ندوی کی کتاب ''میر کارواں'' کا من و عن نقل کیا گیا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر بھرپور تھا اسلیے الگ سے کچھ نہ لکھا گیا، خدا کرے کہ یہ کتاب راہ عمل کے مسافروں کو واقعی عمل کی توفیق ملنے کا ذریعہ بن جائے کہ اب تو صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ زبان پر کئی بار یہ شعر جاری ہو جایا کرتا ہے ؎

میں اٹھ کے اس لئے اس بزم سے چلا آیا
بتاتے سب تھے، مگر عشق تھا کسی نہیں

☆☆☆

گوشۂ غیاث

تأثرات وپیغامات

(بروفات ڈاکٹر محمد غیاث صدیقیؒ)

نوٹ: (مدیر)

مولانا عمیر صدیق ندوی صاحب نے صحیح تعبیر اختیار کی تھی ''شمع روشن بجھ گئی بزم غیاث ماتم میں ہے'' صحیح یہی ہے کہ جس دن سے ڈاکٹر صاحب قبلہ رخصت ہوئے ہیں اب تک دل کی بے قراری کو قرار نہ آسکا، یہاں کے مکینوں کو کیا آتا، آنے جانے والے بھی ان کی کمی کا احساس کیے بغیر نہیں رہ پاتے، ان کی اخلاقی بلندی تھی ہی کچھ ایسی، میں جانتا ہوں کہ مشہور ومعروف ہونا اور صاحب منصب بن جانا اور بات ہے، لیکن انسان بن کر فاتح قلوب بن جانا بڑا کمال ہے، ڈاکٹر صاحب جس سے ملتے تو اپنی تبسم ریزیوں کے سبب اس کے دل ودماغ پر چھا جاتے، بسا اوقات ان کا ایک ایک جملہ اور چھوٹا سا عمل لوگوں کی ضخیم سوانح حیات پر بھاری ہوتا، یہ کیا کم تھا کہ انہوں نے کبھی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم سے بھی ''تو تڑاخ'' سے بات نہیں کی، آپ جناب سے اور پیار محبت سے بات کرنے، مسکراتے اور اپنا کام خود کرتے، کیا یہ پرتو نہیں سیرت نبوی کا کہ وہ آخری سانس تک سب کی دلجوئی کرتے رہے، دوسروں کی دل آزاری کے خیال سے جو کچھ کہنا چاہتے وہ بھی دبا لیتے، چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی ان کا شیوہ بلکہ فطرت ثانیہ تھی، اس میں وہ اپنے وغیر کی تفریق نہیں کرتے تھے، ورنہ آج معاشرہ کا حال یہ ہے کہ لوگ ایک گلاس پانی بھی خود پینا اپنی ہتک سمجھتے ہیں، بے مصرف لوگ بھی ملازمین پر ایسے حکمرانی کرتے ہیں کہ گویا اقلیم سکندری کے تاجدار ہوں، ذرا سی انا کو ٹھیس پہنچ جائے تو بس برس پڑتے ہیں، اور سب بڑھ کر یہ کہ ایسے لوگ دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں، بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی صحبتوں سے میں نے یہ سیکھا کہ کسی کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے، اور نہ جانے انسان کن مجبوریوں کا شکار ہوا ہو، نہ جانے کیسے وہ زندگی کا سفر طے کر رہا ہو، نہ جانے اس میں کون سا جوہر پوشیدہ ہو، دوسروں کی انا اور خودداری کا خاص خیال رکھتے، مزاج پرسی تو ایسے کرے کہ غم سے نڈھال بھی فرحت محسوس کرتے، یہی تو وجہ ہے کہ آج بھی لوگ انہیں یاد کر رہے ہیں، تعزیتی خطوط بھی آرہے ہیں، مختلف رسائل میں بھی ان کے پسماندگان کی تعزیت ہو رہی ہے، ان میں سے کچھ کو یہاں نذر قارئین کیا جا رہا ہے، فون پر جتنے لوگوں نے مجھ سے تعزیت کی اور جو باتیں کہیں افسوس کہ وہ قید قلم میں نہیں لائی جاسکتی ہیں، یہ فون بھی بڑا ظالم ہے کیسی کیسی نادر وبے مثال باتوں کو تاریخ کا حصہ نہیں بننے دیتا، بہر حال ڈاکٹر صاحب ایسے ہی تھے کہ ان کو یاد کیا جاتا رہے، ابھی چند روز قبل ایک غیر مسلم لڑکا ان کی کلینک پر آگرہ سے آیا، پوچھا ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں، بتایا گیا انتقال ہو چکا، رونے لگا اور کہنے لگا کہ اب میری پڑھائی کا کیا ہوگا، میری پڑھائی کا آدھا خرچ وہی دیا کرتے تھے یہ اور اس طرح کے واقعات کا سلسلہ ہے جواب تک جاری ہے۔

کچھ ایسی ہستیاں بھی عالم فانی میں آتی ہیں
فنا کے بعد بھی جنکو زمانہ یاد کرتا ہے

ان کی اخلاقی بلندی کا ایک واقعہ سناتا ہوں اور ان کے ایک ایسے جملے سے روشناس کراتا ہوں جو واقعی بڑی بڑی کتب سوانح پر بھاری ہے اور پھر درمیان سے ہٹتا ہوں، اس مرتبہ ایک گھریلو عارضہ کے

سبب میں نے عید علی گڑھ میں کی، ڈاکٹر صاحب ان دنوں بالکل صاحب فراش ہو چکے تھے، چلنا پھرنا انتہائی دشوار تھا، ان کے گھر میں مہمانوں کا ازدحام تھا اس لیے میں نے خاص عید کے روز جانے سے گریز کیا، پھر جانے پر ایک پریشانی اور ہوتی تھی، وہ بھی گریز کا باعث تھی، ایک طرف ان کی بیماری اور تکلیف دیکھی نہیں جاتی تو دوسری طرف وہ مہمان نوازی کے اہتمام میں ایسے الجھتے کہ آنے والے شرمندہ ہوتے، ان کے صاحبزادے نے بتایا کہ دوران علالت ان سے کہا ''بیٹے دیکھو ہمارے انتقال پر بہت لوگ آئیں گے خیال رکھنا کوئی بھوکا پیاسا واپس نہ جائے''، بہرحال شام کے وقت ان کے بڑے صاحبزادے کا فون آیا، طارق بھائی آپ کہاں ہیں، میں نے کہا گھر پر، کہا ابا آپ کے یہاں آنا چاہتے ہیں میں نے کہا ان کو نہ لائیں بڑی زحمت ہوگی، میں آتا ہوں یہ کہہ کر میں نے فون کاٹ دیا، اور بارش کے دوران ہی میں دولت کدہ پر حاضر ہوا، بے پناہ سکون آمیز مسکراہٹوں سے استقبال کیا اور فرمایا: ''طارق میاں میں نے بہت کوشش کی آؤں مگر حاضر نہ ہوسکا، کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوتی، میں بس اس وجہ سے آنے کے لئے پریشان تھا کہ آپ نے پہلی مرتبہ گھر سے باہر عید کی آپ کی، بچیاں کہہ رہی ہوں گی یہاں ہمارے دادا نہیں ہیں تو کسی نے ہم کو عیدی نہیں دی''

احسان شناس اور حس رکھنے والوں کو اس جملہ کی قدر معلوم ہوگی، کہاں ہے رب ایسی سوچ؟ کہاں ہیں ان اقدار کے حامل لوگ؟ کہاں ہے یہ وضع داری _____ سلام ہے ڈاکٹر صاحب کی عظمتوں کو جو اپنی یادوں کا چمن چھوڑ گئے، میں آپ کو بتاؤں تو حیرت ہوگی کہ وہ اپنی جیب سے مدرسہ اور وہاں آنے والوں پر جو خرچ کرتے تھے وہ تو کرتے ہی تھے، بعض جگہ جب وہ مدرسہ کے کام سے جاتے اور انہیں ہدایا ملتے تو میں شاہد ہوں کہ اس ذاتی ہدیہ کو بھی وہ مدرسہ کے اخراجات میں استعمال کرتے اور اس ہدیہ وعیدی کو وہ کبھی کبھی متعلقین مدرسہ میں ہدیہ وعیدی کے نام سے تقسیم کرتے، شاید اس کے پیچھے وہی تقوی کارفرما ہو جس کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا تھا اپنے ایک عامل کو اگر تم وہاں عامل نہ ہوتے اپنے گھر بیٹھتے تو کیا یہ ہدایا ملتے، یقیناً اگر اس کو وہ استعمال کرتے تو ذرہ برابر بھی حرج نہ تھا، لیکن یہ تھی ان کی شرافت و شخصیت اور ایسا تھا ان کا تقویٰ اور اس پایہ کے تھے وہ مخلص، لیجئے لوگوں کے تاثرات پڑھیے اور دعاء کیجئے کہ اللہ ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور ملت میں کچھ مخلصین ان کے جیسے پیدا ہوں۔

مکتوب مولانا جمال احمد ندوی (مئو ناتھ بھنجن)

مکرمی جناب ڈاکٹر محمد سعد صاحب زید مجدکم

سلام مسنون

خدا کرے کہ آپ سبھی حضرات بخیر وعافیت ہوں۔

آپ کے والد محترم حضرت مولانا ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی کے سانحہ ارتحال سے راقم کو غیر معمولی صدمہ ہوا ہے، کیوں کہ مرحوم مغفور سے ادھر چند سالوں میں جو تعلق خاطر ہوگیا تھا اس میں اپنائیت وخلوص کا ایک اتھاہ سمندر تھا، وہ خردوں سے بھی بڑوں جیسا تعلق رکھتے تھے، راقم جب بھی علی گڑھ پہنچا ان کو سراپا شفقت وعنایت پایا، ڈاکٹر صاحب مرحوم ایک خاموش علمی، دینی، اصلاحی کارواں تھے، ندوہ اسکول کے فکری نمائندگی کا مجسم پیکر علی گڑھ میں بنام ''مدرسۃ العلوم الاسلامیہ اور علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن'' قائم کرکے ندوہ اور مولانا علی میاں سے عقیدت ومحبت کا ثبوت پیش کیا اور علی گڑھ میں دینی ماحول پیدا کرنے کی بھرپور کوشش، کی نیز قرب وجوار میں ارتدادزدہ مسلم پسماندہ طبقہ کے ایمان ویقین کی فکرمندی ان کے ایمانی سوز اور ملی دردمندی، خلوص وللّٰہیت، داعیانہ تڑپ اور ایثار وقربانی کا اعلیٰ مظہر ہے۔

یہ سب ان کے لئے صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گے اور آخرت میں ترقی درجات کا باعث بھی، یقیناً وہ مختصر عرصہ میں ایک سدا بہار علمی چمن کو آباد کرکے اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے! خدا ان کو اپنے شایانِ شان اجر عظیم سے نوازے، یقیناً ان کے سانحہ ارتحال سے ایک خلا ہو چلا ہے!! رہے نام اللہ، کالہٰذا احقر آپ کے اس غم میں برابر کا شریک ہے اور اہل خانہ کو تعزیت وتسلی پیش کرتا ہے۔ ان اللّٰہ ما اعطی ولہ ما اخذ ولکل شیء عندہ اجل مسمی

اس فانی دنیا کا یہی دستور ہے تاہم قلبی تعلق کی وجہ سے جدائی کا صدمہ ہر فرد بشر کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے کل شیء ھالك الا وجھة والدہ کو سلام عرض کیجئے ان شاء اللہ موقع ملا تو علی گڑھ آمد ہوگی اور ڈاکٹر ایوبی کو بھی سلام عرض کیجئے۔

خیر اندیش
جمال احمد

☆☆☆

مکتوب محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی (احمد آباد)

محترمی وذکری جناب ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی صاحب! مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں خون دل سے تواضع کروں کہ اشکوں سے
شرف ملا ہے مجھے غم کی میزبانی کا

ماہنامہ ''ندائے اعتدال'' کا تازہ شمارہ ملا، پڑھ کر نہایت افسوس اور دلی صدمہ ہوا کہ جناب ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی اللہ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے بالکل نا آشنا تھا صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ماہنامہ ندائے اعتدال کے نگراں ہیں اور بس!!

لیکن اس شمارے کے مضامین وتاثرات پڑھ کر جب مجھے اس ''درنایاب'' اور ''گوہر شاہوار'' کی قیمت کا انداز ہوا تو اپنی محرومی پر بڑا دکھ ہوا۔

ایسی چنگاری بھی یارب میرے خاکستر میں تھی

حق ہے علی گڑھ کو کہ وہ سینہ کوبی کرے، روا ہے مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے لیے کہ وہ ماتم کرے، فاؤنڈیشن نے اگر پرچم جھکا دیے، تو یقیناً اس نے محبت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، شرافت نے اگر تعزیت کی تو کون ہے جو اس کو مطعون کرے، اخلاق واخلاص کی گم شدگی پر اگر کوئی فریاد کر رہا ہے تو اسے فریاد کرنے کا بجا طور پر حق ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا شمار ان شخصیتوں میں ہرگز نہ تھا جن کے چلے جانے سے صرف آنکھیں روتی ہیں، وہ تو ان یکتائے زمن اشخاص میں تھے جن کے رخت سفر باندھ لینے سے دل رویا کرتے ہیں۔

دفعت بك الجليل وأنت حيٌّ
فمن ذا يدفع الخطب الجليلا

اس شمارے کو پڑھ کر ہمیں یہ احساس ہوا کہ وہ بے شمار خوبیوں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے انسان تھے، وہ ایک مثالی وجود تھے، جدید وقدیم کا خوبصورت مجموعہ اور ان کے محاسن کا حسین سنگم تھے، وہ صبر واستقامت کے پیکر اور اخلاق واخلاص کے پتلے تھے، چھوٹوں کو عظمت ورفعت کی بلندی پر پہنچا کر خوش ہونے والے انسانوں میں تھے، ان کی سیرت کے مطالعہ کے بعد دل ان کے آستانے پر جھک گیا، دماغ ان کی عظمت ورفعت کا قائل ہوگیا۔ اور شدت سے یہ احساس ہوا کہ امت مسلمہ اپنے ایک مخلص، وفا شعار اور فرض شناس سپوت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔

اس ماہنامے کے مطالعہ کے بعد خاص طور پر میں نے یہ بات نوٹ کی ہر مضمون نگار نے اپنے تاثرات کو بہترین قالب میں ڈھالنے کی ہنرمند کوشش کی ہے، افراط وتفریط سے بہت حد تک پاک صاف ہے، دماغ کی دیانت اور قلم کی امانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کسی بھی شخصیت کے محاسن ومحامد کے اقرار کے وقت بخل سے کام نہ لیا جائے۔

آپ نے ان کی شخصی عظمت، افکار کی معنویت اور سیرت کی سچائی والے رخ کو متوازن اسلوب میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ الفاظ وتعبیرات کا پیرہن بخشا ہے۔ مجھے آپ کا یہ انداز بڑا پسند آیا، الفاظ کے انتخاب میں بھی ذہن ودماغ نے آپ کا بڑا ساتھ دیا ہے، ورنہ عام طور پر ایسے مضامین تحریر کرتے وقت تحریر بے ترتیبی کا شکار ہونے لگتی ہے اور بسا اوقات افراط وتفریط کا مظہر بھی۔

یقیناً ڈاکٹر صاحب کی وفات سے ہر دل رنجور اور ہر قلب پاشیدہ ہے، لیکن اس دنیا میں آنا بھی تو درحقیقت جانے ہی کی تمہید ہے، کتنی تصویریں ہیں جو اس ''آئینہ خانہ'' میں روزانہ ڈوبتی اور ابھرتی رہتی ہیں، کتنی فضیلتیں ہیں جو لپٹی ہوئی ہیں،

کتنی عظمتیں ہیں جو زیر خاک ہیں، کتنی شخصیتیں ہیں جو محو خواب ہیں، کتنی ہستیاں ہیں جو استراحت فرما رہی ہیں، اور نہ جانے کتنی عبقری شخصیات ہیں جو صبح قیامت کے انتظار میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس بستی کے مکین ہو گئے، جہاں ہر کسی کو اپنے اپنے وقتوں پر جانا ہے کہ ؎

آج وہ، کل ہماری باری ہے

لیکن یہ بات بھی مسلم ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیات ہر روز آسانی سے نہیں پیدا ہوا کرتیں، جنہیں مر کر بھی لوگ یاد رکھا کرتے ہیں ؎

کچھ ایسی ہستیاں بھی عالم فانی میں آتی ہیں
فنا کے بعد بھی جن کو زمانہ یاد کرتا ہے

وہ مدتوں انشاء اللہ اپنے علم وفضل، اخلاق و اخلاص، خدمات و کارنامے اور سیرت وصورت کے لحاظ سے یاد کیے جاتے رہیں گے، ان کی یادوں کا گلشن سدا مہکتا ہے ہی رہے گا، ان کے انفاس کی خوشبو آتی ہی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ آپ کو مزید حوصلہ عطا فرمائے، اور ان کے پسماندگان اور اراکین مدرسہ کو صبر جمیل اور نعم البدل عطا فرمائے، اور ان کو غریق رحمت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

اعتذار: ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔

شریک غم
محمد خالد ضیا صدیقی ندوی

☆☆☆

ملت کو ڈاکٹر غیاث ندوی جیسے بے لوث خادم اور دینی تعلیم کے دلدادہ کی ضرورت ہے

(روزنامہ اودھ نامہ ۲/۱۱/۲۰۱۵ء)

درس قرآن کے پروگرام میں پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کا خطاب

علی گڑھ۔ اقرا کالونی میں درس قرآن پروگرام کے آخر میں پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی مرحوم سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ آج کے دور میں ایسے لوگ شاذ و نادر نظر آتے ہیں جو ذاتی مفاد کو تیاگ دے کر اپنے آپ کو دینی، ملی و سماجی خدمات کے لیے وقف کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بلا شبہ ایسے ہی نادر افراد میں سے تھے۔ لوگوں کے کام آنا ان کا شیوہ تھا۔ بلا لحاظ مذہب وملت اور مقام ومرتبہ مرحوم ہر ضرورت مند اور پریشاں حال کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ سماجی وملی خدمت میں سرگرداں رہنے والوں کے مخالفین کا پیدا ہونا کوئی انہونی بات نہیں۔ مرحوم کی ذاتی زندگی کے بعض قریبی مشاہدین نے بیان کیا کہ ان کا کوئی مخالف بھی کسی ضرورت سے ان کے گھر پر دستک دیتا تو نامراد نہ لوٹتا۔ درحقیقت انہوں نے قرآن کی اس تعلیم کو حرزِ جاں بنا لیا تھا کہ لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو، جیسا کہ اللہ نے تم پر احسان فرمایا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اس ارشاد نبوی ﷺ کے مصداق تھے کہ تم میں بہتر وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔ مرحوم کی زندگی کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ ان کے محلّہ (جمال پور) سے لے کر بہت دور دور تک کے لوگ ان کے جذبۂ ہمدردی وتعاون اور دریا دلی سے مستفیض ہوئے۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے اس بات پر خاص زور دیا کہ ڈاکٹر صاحب کی دینی وعلمی اور ملی وسماجی خدمات کے بہت سے نقوش ملتے ہیں، لیکن علی گڑھ میں ان کی زندہ و تابندہ اور سب سے قیمتی یادگار مدرسۃ العلوم الاسلامیہ (ملحقہ ندوۃ العلماء) ہے۔ ۲۰۰۳ء میں اسے قائم کرنے کے بعد انہوں نے اس کے نظم ونسق کی بہتری اور توسیع وترقی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا حتی کہ اپنی میڈیکل پریکٹس کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ جدید تعلیم کے عظیم مرکز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نواح میں ایک دینی درس گاہ قائم کرنا، نہایت خوش اسلوبی سے اس کا نظم چلانا علمِ دین کے فروغ کی راہ میں مرحوم کی یہ ایک بہت بڑی اور نہایت قابلِ قدر خدمت ہے۔ ممتاز

اسکالر پروفیسر سید سلمان ندوی (ڈربن، ساؤتھ افریقہ) نے اپنے تعزیتی پیغام میں بجا فرمایا کہ بے سروسامانی کے عالم میں محض توکل علی اللہ کے ساتھ علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارہ قایم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان سب خدمات جلیلہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد غیاث صاحب مرحوم سادگی وانکساری، بردباری ووضع داری، وسیع النظر فی وفیاضی، نرم گوئی وشیریں زبانی اور ملاقات کے وقت تبسم فرمائی جیسی صفات حمیدہ سے متصف تھے۔ ان کی زندگی سے ایک نہایت قیمتی سبق یہ ملتا ہے کہ کسی مشکل سے مشکل کام کو کرنے میں مقصد کی پاکیزگی، سنجیدگی اور قربانی کے جذبہ کی کارفرمائی ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر غیاث صدیقی ندوی مرحوم

(معارف/دارالمصنفین، نومبر ۲۰۱۵ء)

علی گڑھ کے مشہور طبیب و معالج ڈاکٹر غیاث صدیقی نے بھی اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اب کیا کہا جائے کہ طبیب ومعالج تو بہت ہیں، مسیحا نفس کتنے ہیں؟ معالج تو وہ بھی شکریہ کے لائق جس کی نباضی اور تشخیص، ظاہری بیماریوں سے شفا بخشے لیکن اگر یہ علاج جسم کے ساتھ روح وجاں کا بھی ہو اور سامان میں دوائے دل بھی شامل ہو تو شکریہ کے ساتھ شکر کی کیفیت کو شامل ہی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اللہ کے ان بندوں میں تھے جن کے ذریعہ جسم وجاں کی صحت، مقدور بھر عام ہوئی، انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے علی گڑھ میں اسی کے زیر سایہ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ قائم کیا، مدرسۃ العلوم تو مسلم یونیورسٹی کا پہلا اور اصل نام ہے لیکن الاسلامیہ کے اضافہ نے اصل مقصد کی یاد کو بھی زندہ کر دیا، اس مدرسہ کے لئے انہوں نے اپنی ساری توانائی صرف کر دی۔ لائق استادوں اور کارگزاروں کی ایک جماعت تیار کی، طلبہ کے لیے خصوصی علمی مجلسوں کا اہتمام کیا، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور رفقائے دارالمصنفین پر بھی توسیعی خطبات کیے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار پر ایک بین الاقوامی سیمینار کے انعقاد کی روح بن کر قابل رشک بن گئے۔ قابل رشک تو وہ اپنی فروتنی، انکسار، تواضع اور دل میں اتر جانے والی خندہ جبینی سے پہلے بھی تھے، ملت کا درد رکھنے والے اور گوشہ تنہائی میں ایسی خاموش خدمات والے اب ہیں ہی کتنے؟ ایسے میں ہر کمی ناقابل تلافی لگتی ہے۔ اللھم ارحمہ۔

☆☆☆

مولانا ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی کا انتقال

(پندرہ روزہ تعمیر حیات-ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

علی گڑھ کی معروف شخصیت، صدر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن ناظم مدرسۃ العلوم الاسلامیہ اور مختلف اسکول و مدارس کے بانی مولانا ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی کا طویل علالت کے بعد بروز منگل ۲۱/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۶/اکتوبر ۲۰۱۵ء جمال پور علی گڑھ میں ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کی خبر عام ہوتے ہی اطراف واکناف کے اہل تعلق مولانا مرحوم کی رہائش گاہ اور مدرسہ پہونچ گئے، ۷/اکتوبر کی صبح بروز بدھ عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور مدرسہ کے جوار میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی، مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی، مولانا محمود حسن حسنی ندوی پر مشتمل ایک سہ رکنی تعزیتی وفد اپنی نیابت میں بھیجا، اور مرحوم کی خدمات کو سراہا اور تعزیتی کلمات پیش کیے، مرحوم حضرت مولانا مدظلہ سے بیعت و استرشاد کا بھی تعلق رکھتے تھے، ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد سعد صدیقی کے نام اپنے تعزیتی مکتوب میں ان کی

خدمات اور تعلق کو سراہتے ہوئے اظہار تعلق فرمایا، پسماندگان میں ڈاکٹر صاحب کے تین صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہیں، مرحوم قوم وملت کی خدمت میں مصروف کار رہے، سنجیدہ مزاج، قناعت پسند اور خلیق شخصیت کے حامل تھے۔

اللہ رب العزت جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔

☆☆☆

الدكتور محمد غياث صديقي الندوي في ذمة الله تعالىٰ

(مجلة البعث الإسلامي، ندوة العلماء لكناؤ، نوفمبر ٢٠١٥)

انتقل إلى رحمة الله تعالىٰ الشيخ الدكتور محمد غياث الندوي مؤسس مدرسة العلوم الإسلامية ورئيس مؤسسة الشيخ أبي الحسن علي الندوي التعليمية والإصلاحية في بلدة عليكراه يوم الثلاثاء ٢١/ من شهر ذى الحجة لعام ١٤٣٦ھ الموافق ٦/ من شهر أكتوبر ٢٠١٥م في وطنه بعليكراه، وبعد ما أجريت عملية جراحية في الدماغ منذ مدة، وظل بأخذ العلاج للعودة، إلى حالة الصحة السليمة، وكان يرجى أن الله تعالىٰ سيكتب له البرء الكامل، وفعلا عاد إلى حالة صحيحة جيدة، إلا أن المرض عاد إليه مرة ثانية، ورغم جميع المحاولات العلاجية في مستشفى دلهى الكبير لم يكتب له الشفاء ولبى نداء ربه وغادر إلى آخرته، فإنا لله وإنا إليه راجعون.

كان الدكتور محمد غياث من أبناء ندوة العلماء القدامى، وقد نال التربية الدينية لدى سماحة العلامة الإمام أبي الحسن علي الحسني الندوي رحمه الله، فكان يحبه ويزوره حينا الأخر، وفي خلال ذلك استشار سماحته تأسيس مدرسة في بلدة عليكراه، فوافق على ذلك، فقام ببناء هذه المدرسة في بلدة هي معروفة بجامعة عليكراه الإسلاية، وذلك لكى تكون معلمة تعليمية إسلامية بجوار الجامعة، وكان هدفه بذلك ايجاد الجامعية العملية والعلمية وتمثيل الوسطية الدينية التى دعا إليها مؤسسو ندوة العلماء، فكانت المدرسة على غرار مناهج وبرامج ندوة العلماء، وناجحة في الهدف الذي توخته. فكان طلابها في المرحلة الأخيرة من الدراسة يأتون إلى جامعة ندوة العلماء ويؤدون الامتحان السنوي، ثم يلتحقون بمرحلة العالمية ويكملون دراستهم في دار العلوم لندوة العلماء.

كان يساعده في الشؤون التعليمية والإدارية نجله الكبير الدكتور محمد سعد، والدكتور الأستاذ محمد طارق الندوي الأيوبي، وكانت المدرسة قائمة بإنجاز برنامجها التعليمي تحت إشراف الدكتور محمد غياث الندوي وظلت قائمة بذلك والحمد لله أيام مرضه كذلك، ولولا أن بنائها قائم على أساس من الإخلاص وصلاح النية، لكانت قد أصيبت بضعف أو خلل في شئونها. إلا أنها لا تزال قائمة بنفس الروح والقوة في إنجاز مشروعها التعليمى والإنشائى، ونرجو لها الدوام والاستمرارية بمشيئة الله تعالىٰ.

إننا نعزى أبناء وأنصار الفقيد وجميع العاملين معه، وندعو الله سبحانه أن يغطيه برحمته ويغفرله زلاته ويجزيه بأحسن ما يجزي به عباده المخلصين، ويسكنه فسيح جناته ويلهم أهله وأنجاله وذوية والجميع الصبر الجميل.

☆☆☆

گوشۂ غیاث

حضرت ڈاکٹر غیاثؒ کے حضور میں

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندویؒ کی شخصیت عام طبیبوں جیسی تھی۔ جمال پور میں ان کا مطب مشہور تھا۔ مریضوں کی کثرت سے ہر وقت مطب بھرا رہتا تھا۔ جب بھی ان کے مطب میں گیا اس کو مریضوں سے پر پایا۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ سڑک تک چھوڑنے آتے اور بڑی محبت سے ملتے، کبھی میں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ ڈاکٹر صاحب اتنا بڑا کارنامہ کر جائیں گے۔

پھر میں نے یہ تبدیلی دیکھی کہ ہر سال حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ کو علی گڑھ مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں بلانے لگے۔ حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب بھی ہر سال رمضان سے قبل ڈاکٹر غیاث صاحب کے جلسہ میں مع اپنے وفد کے ضرور تشریف لاتے۔ برسوں مولانا سید رابع صاحب پابندی سے سالانہ جلسے میں تشریف لاتے رہے اور ان کے ساتھ ندوہ کے دوسرے علماء بھی تشریف لاتے۔ حضرت مولانا طویل تقریر فرماتے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ تمہید ہے ایک بڑے کارنامے کی۔ حضرت مولانا کے اس طرح ڈاکٹر غیاث کے جلسہ میں پابندی سے شرکت سے یہ اندازہ تو ہوتا تھا کہ حضرت مولانا کی توجہ ان کی طرف ہے، یہ اس توجہ کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر غیاث صاحب نے دھیرے دھیرے ایک پورا ادارہ قائم کر دیا؟ یہ اثر ہے حضرت مولانا کی مسلسل آمد کا اور شرکت کا حفظ قرآن کے سالانہ جلسہ میں۔

جمال ہم نشیں درمن اثر کرد
وگر نہ ہما قائم کہ ہستم

چنانچہ پہلے ڈاکٹر غیاث صاحبؒ نے علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فائنڈیشن کی بنیاد رکھی اس کے تحت جلسے ہونے لگے اور اس کا ایک مرکز تعمیر کیا گیا۔ اس وقت تک بھی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب اتنا بڑا کام کرنے جا رہے ہیں اس لئے کہ ان کے دن تو مطب ہی میں اور مریضوں کے اژدحام میں گذر رہے تھے مگر ڈاکٹر صاحب کے پاس ندوہ کی شاخ بنانے کے لئے ان کے اعوان و انصار بھی جمع ہونے لگے اور ایک مدرسہ قائم ہو گیا اب ڈاکٹر غیاث صاحب کی توجہ بجائے مطب کے مدرسہ کی طرف ہو گئی۔ عمارتوں کی تعمیر میں وہ لگ گئے۔ ایک بڑے جلسہ میں وہ ذرا دیر سے تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تو مزدوری کر رہا تھا اس لئے تاخیر ہو گئی، حضرت ڈاکٹر صاحب مزدوروں کے ساتھ کام کرا رہے تھے۔

پھر رابطۂ ادب اسلامی کا جلسہ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کی عمارت میں ہوا تو محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنا بڑا کام کر ڈالا۔ جلسہ آل انڈیا پیمانہ پر ہوا اور عمارت اتنی ماشاءاللہ اتنی وسیع وعریض تھی کہ سارے جلسے اسی عمارت کے ایک حصہ میں ہوئے۔

اس جلسہ سے مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کی شہرت بہت بڑھ گئی اور خود آخری جلسہ میں حضرت مالانا سید محمد رابع حسنی ندوی تشریف لائے اور ان کی مؤثر وعالمانہ تقریر ہوئی۔ مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی بھی تقریر ہوئی۔ لیکن یہ تمہید تھی ایک عالمی جلسہ کی۔

میں مدرسۃ العلوم الاسلامیہ گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اطلاع دی کہ ہم لوگ ایک عالمی سیمینار علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ پر کر رہے ہیں اور اس میں عرب علماء بھی شرکت کریں گے۔ چنانچہ وہ جلسہ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے کیمپس میں منعقد ہوا اور انتظام حضرت ڈاکٹر صاحب اور ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب نے کیا اور سارے جلسے پورے نظم وضبط کے ساتھ ہوئے۔ حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی تینوں دن جلسوں میں موجود رہے اور ان کی کئی تقریریں ہوئیں۔

سیمینار تو ہوتے رہتے ہیں مگر یہ سیمینار بڑی عظمت کا حامل تھا، اس میں ۵۴ عرب اسکالر تمام ممالک عربیہ سے آئے اور انہوں نے مقالات پڑھے اس سیمینار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے جملہ مقالات شائع کر دئے گئے۔ عربی مقالات تو سیمینار کے انعقاد سے قبل ہی چھپ گئے اور جب سیمینار ہوا تو مقالات پوری کتاب کی شکل میں تقسیم کر دیئے گئے۔ اور مقالہ نگاروں کو پیش کر دیے گئے، یہ زبردست محنت تھی ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب کی اور ڈاکٹر غیاث صاحب کی توجہ کی۔ پھر کچھ مدت بعد ان مقالات کا مجموعہ شائع ہوا جو اردو میں تھا۔ اردو مقالات بہت ضخیم ہیں جن لوگوں نے بھی مقالات پڑھے وہ سب اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

اتفاق سے آخری دن کا صدر جلسہ میں تھا ۹/ بجے سے دو بجے تک دو سیشن تھے میں نے ڈاکٹر ایوبی سے کہا کہ اب دوسرا سیشن شروع کر دیا جائے انہوں نے فرمایا کہ آپ ہی دوسرے سیشن کے صدر بنے رہیے۔ اگر کوئی تبدیلی کی گئی مجمع منتشر ہو جائے گا اور لوگ چل دیں گے چنانچہ آخر تک میں بیٹھا رہا۔ سارے مقالات ہو گئے۔ ہمارے ناظم صاحب بڑے جری تھے وہ مقالہ نگار کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ وہ جلد مقالہ ختم کرے۔ حضرت ڈاکٹر غیاث صاحب پورے جلسہ میں موجود رہے اور جلسہ ختم ہونے پر میرے ساتھ نکلے اور حضرت مولانا سلمان حسینی بھی آخر تک تشریف فرما رہے جلسہ بڑا کامیاب رہا۔ ۹/ بجے سے ۲/ بجے تک سارے مقالات بفضل تعالیٰ پڑھ دیئے گئے۔ میں نے بھی صدارتی تقریر پُر جوش کی۔

میں ایک دن حاجی عثمان صاحب کے گھر گیا۔ وہ یونیورسٹی لائبریری میں تھے اب ریٹائر ہو گئے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کے قریبی عزیز تھے میں بعد نماز فجر گیا ڈاکٹر غیاث صاحب باہر تشریف لائے اور مجھے اندر لے گئے۔ کوئی خاندانی مسئلہ پر یہ لوگ بحث کر رہے تھے۔ مجھ سے ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں میں کسی اور سے نہیں کہہ سکتا۔ لوگ وہاں زیادہ تھے فرمایا کہ میں پھر کہوں گا۔ مگر وقت گذر گیا وہ بات وہیں رہ گئی، خدا معلوم کیا دل کی بات مجھ

سے کہنا چاہتے تھے۔

حضرت علی میاں سیمینار میں ڈاکٹر صاحب نے بڑے مجمع میں اپنا استقبالیہ خطبہ پڑھا۔ عجیب بات یہ ہے صبح یا شام جب بھی میں مدرسۃ العلوم گیا حضرت ڈاکٹر غیاث صاحب کو مدرسہ میں موجود پایا۔ مدرسہ کے ہر جلسہ میں وہ مجھ کو بلاتے تھے اور وہ خود بھی موجود رہتے تھے اور میں صاف کہتا ہوں کہ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے طلبہ کی استعداد بہت اعلی ہے اس میں جو سالانہ عربی بیت بازی ہوتی ہے وہ زبردست شعری مقابلہ ہے اور خوب اشعار یاد کرتے ہیں۔ میں نے ایک دو بار عربی عبارتوں کو اور اشعار کو زبانی یاد کرنے پر اور رٹنے پر زور دیا مجھے تعجب ہوا جب ایک طالب علم نے مجھ سے بتایا کہ اس نے مغرب سے عشاء تک کا وقت رٹنے کے لئے خاص کرلیا ہے۔

حضرت ڈاکٹر غیاث صاحب جو کام کرتے تو اس کی اطلاع مجھے ضرور دیتے۔ مدرسہ کے سامنے ایک وسیع زمین خریدی تو اس کی اطلاع مجھے دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی ذاتی جد وجہد سے اتنا بڑا ادارہ قائم کر دیا۔ رات دن اسی میں لگے رہتے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ ایک اچھے طبیب ہونے کی وجہ سے جو طلبہ بیمار پڑتے ڈاکٹر صاحب ان کا علاج بھی کر دیتے۔

حضرت ڈاکٹر غیاث کا حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب قبلہ مدظلہ العالی خاص خیال رکھتے۔ چنانچہ جب حضرت مولانا عبداللہ محمد الحسنی کا انتقال ہوا تو اس وقت حضرت مولانا رابع صاحب کو بلانے کے لئے ڈاکٹر غیاث صاحب تکیہ کلاں روانہ ہوگئے اپنی کار سے، اتنا سخت حادثہ تھا کہ مجھے یقین تھا کہ حضرت مولانا رابع صاحب تشریف نہ لائیں گے مگر حضرت مولانا آخری جلسہ میں تشریف لائے اور ایک عالمانہ تقریر فرمائی۔ یہ معجزہ تھا ڈاکٹر غیاث صاحب کے تکیہ کلاں تک سفر کرنے کا۔ پھر حضرت مولانا کے ساتھ ایک پورا قافلہ بھی آیا حضرت مولانا کی ایک تقریر مسلم یونیورسٹی میں بھی ہوئی۔

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے سامنے ڈاکٹر صاحب نے جو وسیع قطعۂ ارضی خریدا اور اس میں ایک ادارہ تعمیر کرا رہے تھے، اس کو پھلتا پھولتا دیکھتے کہ وقت موعود آ پہونچا۔ اگرچہ پہلی بار آپریشن بہت کامیاب رہا، مگر مرض بار بار ابھرتا رہا۔

پروفیسر رفیع احمد علوی کے انتقال پر ہم سب یونیورسٹی کے قبرستان میں تدفین کے بعد ٹھہر گئے۔ ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب اور ڈاکٹر غیاث صاحب گفتگو کرنے لگے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہی تکلیف پھر ابھر آئی ہے اور دوبارہ پھر آپریشن ہوگا۔ اس بار تو مجھے مایوسی ہوئی مگر وہ آپریشن کامیاب رہا۔ تیسری بار پھر مرض ابھرا تو ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ الغرض ڈاکٹر صاحب تو اپنا مشن پورا کر چکے تھے ایک ادارہ قائم کر چکے تھے۔ ایک ماہنامہ ندائے اعتدال نکال چکے تھے اور انہوں نے زندگی سے ایک بڑا کام لے لیا اور امتِ اسلامیہ کی خدمت کی۔

فادخلی فی عبادی، وادخلی جنتی

ہم ان کو ڈاکٹر کہتے ہیں اور وہ ایک کامیاب طبیب تھے مگر وہ ایک عالم دین بھی تھے اور ندوہ العلماء سے سند فراغت حاصل کیا، وہ ایسے طبیب وعالم تھے کہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

☆☆☆

گوشۂ غیاث

جیسے کچھ آسماں نے چھین لیا

انس بلال ندوی، علی گڑھ

۶/اکتوبر ۲۰۱۵ء کو ہمارے محسن ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی نے اپنی آخری سانسیں لیں۔ ہمیں انہیں مرحوم کہتے ہوئے افسوس ہورہا ہے۔ وقت مغرب کا تھا جب آپ کی وفات کی جانکاہ خبر کانوں میں پڑی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ کچھ دیر تک پچھلے دس سالوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

وہ مبارک ساعت جب چند نفوس مل کر ایک دینی درسگاہ قائم کررہے تھے۔ وسائل نہ ہونے کے برابر، سامان سفر کچھ بھی نہیں لیکن ایک عزم تھا، خدا کی ذات پر بھروسہ تھا۔ غالبا ۲۰۰۳ء کی بات ہوگی جب ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب نے مدینۃ العلوم جمال پور میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ایک ذیلی شاخ ''مدرسۃ العلوم الاسلامیہ'' کے نام سے قائم کی۔ چار پانچ طلباء اور ایک استاد کل یہ کائنات تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس مرکز علم نے ترقی کی منزلیں طے کیں اور ایک سدا بہار درخت بن گیا۔

ابتدا میں مدرسۃ العلوم کی کوئی باضابطہ عمارت نہیں تھی صرف مدینۃ العلوم جمال پور کے ایک حصہ میں یہ قائم تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی شبانہ روز کوششوں کی بدولت مدرسہ کے لئے ایک وسیع وعریض زمین کی فراہمی ہوسکی۔ اس وقت سے آج تک مدرسۃ العلوم الاسلامیہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ علم وعمل کی روشنیاں بکھیر رہا ہے اور ہزاروں تشنگان علم دین کو سیراب کررہا ہے۔

ہم چار پانچ طلباء کا Bach سب سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء تعلیم حاصل کرنے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہم کو خصوصی طور پر نصیحت فرماتے۔ مفید مشوروں سے نوازتے۔ آپ کی سنجیدہ وشریف شخصیت آج بھی آنکھوں کے سامنے گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ کا وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنا، چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ مگر وقار کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں ندوۃ العلماء رچا بسا ہوا تھا تو علی گڑھ کی شاندار روایات بھی اپنی تمام تر جلوہ سامانی کے ساتھ آپ کی شخصیت کا عنصر تھیں۔

مرحوم کی شخصیت کا ایک بہت نمایاں پہلو جو آج کے مادی دور میں ملنا بہت مشکل ہے یہ تھا کہ آپ نے مدرسۃ العلوم کو بہت کچھ دیا لیکن مدرسہ سے ذاتی فائدہ کبھی نہیں اٹھایا۔ حتی کہ اپنی جیب خاص سے مدرسہ کی ضرورتوں کی تکمیل سے بھی دریغ نہیں کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، برسات میں چھت ٹپکنے کی وجہ سے مدرسہ کی عمارت میں پڑھنا اور رہنا دشوار ہو رہا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے جمالپور میں واقع اپنی مارکیٹ کے بیسمنٹ میں عارضی طور پر مدرسہ کو منتقل کر دیا اور کم وبیش ایک ماہ تک اسی بیسمنٹ میں مدرسہ چلتا رہا۔ یہ تھا وہ جذبہ جو مرحوم کے اندر موجزن تھا۔ آپ نے اپنے خون پسینہ سے اس چمن کو سینچا تھا۔ اور اپنی زندگی میں ہی اس کو پھلتا پھولتا دیکھ بھی لیا تھا۔

ملاقات کے لئے بارہا آپ کے مطب پر جانا ہوتا، ہمیشہ محبتوں سے نوازتے، چائے سے ضیافت فرماتے، احوال پوچھتے، دریافت کرتے کہ کچھ لکھ پڑھ بھی رہے ہو یا نہیں، جب بھی گیا آپ کو مدرسہ کی ترقی کے بارے میں ہی متفکر پایا، مدرسہ کے تعاون کے لئے اپنی ذات کو اگر خفت اٹھانی پڑتی تو اس کو بھی انگیز کرتے۔

مرحوم کو مولانا علی میاں کی ذات سے انتہائی حد تک عشق تھا۔ اور یہی تعلق آپ کے خانوادے سے آخری دم تک رہا۔ استاذ گرامی مولانا عبداللہ حسنی صاحب مرحوم کا بہت اکرام کرتے، ہر طریقہ سے خیال فرماتے۔

کسے معلوم تھا کہ جو شخص لوگوں کا کامیاب علاج کرتا تھا اور ان کے لئے شفا کا سامان بنتا تھا وہ خود ایک جان لیوا مرض میں مبتلا ہوکر ہم سے جدا ہوگا اور اپنے پیچھے ایک جہاں کو سوگوار کر جائے گا، اللہ مرحوم کی بال بال مغفرت کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

زبان وادب

خودنوشت سوانح عمریوں میں
''آپ بیتی'' (دریابادی) کی ادبی اور تعمیری حیثیت

محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی
جامعہ فیضان القرآن، احمد آباد، گجرات

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی عیسوی علم وفن، شعروادب اور فضل وکمال کی زرخیزی اور شادابی کی صدی ہے، اگر اس صدی کا جائزہ لیا جائے تو علوم وفنون کی ہر شاخ بلکہ ہر میدان کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد آپ کو مل جائے گی، اصحاب فکر ونظر ہوں یا ارباب عقل ودانش، جلیل القدر علماء و مشائخ ہوں یا رفیع المرتبت اہل قلوب واصحاب باطن، بلند پایہ مفکرین ہوں یا مخلص سیاسی قائدین، صف اول کے ادباء ہوں یا ماہر انشاء پرداز، تغزل گو شعراء ہوں یا اعلی درجہ کے سخن فہم، دیدہ ور مبصرین ہوں یا نشتر خوشتر لگانے والے ناقدین، خطابت کے تاجدار ہوں یا لوح وقلم کے پاسبان، بلند قامت مؤرخین ہوں یا باکمال سوانح وسیرت نگار، بے باک صحافی ہوں یا بے لوث خادمان دین ووطن، دعوت وتبلیغ کے علمبردار ہوں یا باطل کے لئے تلوار ثابت ہونے والے سرفروش مجاہدین، غرض کہ شعبہ ہائے حیات کے ماہرین اور باکمال انسانوں سے اس صدی کا دامن مالا مال اور اس کا نخل حیات نہال ہے، اردو زبان وادب کی ہمہ جہت ترقی کے لحاظ سے بھی یہ صدی بڑی زرخیز اور ساز گار ثابت ہوئی ہے، یہ کہا جائے تو بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اس صدی میں ادب کی تقریبا سبھی اصناف سخن میں تیز رو تبدیلیاں ہوئیں، بلکہ بعض نئی اصناف بھی معرض وجود میں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا ارتقائی در وبام عروج پر پہونچ گیا۔

خودنوشت سوانح عمریوں کی تاریخ اگر پرانی نہیں تو نئی بھی نہیں ہے، لیکن بیسویں صدی کے اختتام تک اس صنف ادب نے ایسی حیرت انگیز ترقی کر لی کہ اس کے معیار واعتبار کا قد اونچا سے اونچا ہوتا چلا گیا اور چند ایسی کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جنہوں نے گویا شہرت دوام حاصل کر لی اور جنہوں نے اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں اور رعنائیوں کے باعث قارئین کو اپنا عاشق نہیں معشوق بنا کر ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔

اس صدی میں لکھی جانے والی خودنوشت سوانح عمریوں کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''آپ بیتی'' کا مقام ومرتبہ متنوع حیثیتوں سے دیگر ''آپ بیتیوں'' کے مابین سب سے ممتاز اور روشن نظر آئے گا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت سے کس کے کان نا آشنا ہیں؟ مولانا ان شخصیات میں ہیں جو صدیوں میں بطن گیتی سے جنم لیا کرتی ہیں، آپ اگر ایک طرف باکمال اور کامیاب مفسر قرآن تھے تو دوسری طرف اردو کے صاحب طرز ادیب اور ماہر انشاء پرداز بھی، نامور اور بے باک صحافی تھے تو غیرت مند اور نڈر سپاہی اسلام بھی، ماہر فلسفہ و نفسیات تھے تو نقد وتبصرہ اور طنز نگاری کے بے تاج بادشاہ بھی،

مانے ہوئے معلم اخلاق تھے تو ایک عظیم مصلح اور مربی بھی، اسلام اور اسلامی ثقافت وتمدن سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے عاشق صادق تھے تو مغربی تہذیب اور یورپین کلچر وثقافت کی سطحیت کو واشگاف بلکہ بے نقاب کرنے والے شیر دل قلمکار بھی، ایک متحرک، روشن ضمیر، روشن دماغ اور حقیقت شناس و آفاق بیں عالم تھے تو پابندیٔ اوقات میں طاق اور کتب بینی و مطالعہ کے شوقین نہیں حریص تھے۔ غرضیکہ قسام ازل نے آپ کی ہشت پہل شخصیت میں اتنی متنوع اور اعلی صلاحتیں اور قابلیتیں جمع فرمادی تھیں جو اہل کمال اور نصیبہ وروں ہی کا حصہ ہوا کرتی ہیں کہ وما یلقاها إلا ذو حظ عظیم۔

مولانا دریابادی کے سحر انگیز قلم سے یوں تو ایک درجن سے زائد کتابیں نکل کر حسن قبول حاصل کر چکی ہیں، لیکن ان کتابوں میں ''آپ بیتی'' اپنی جامعیت و اختصار اور ادب و انشاء پردازی، سادگی و بے ساختگی کے لحاظ سے مولانا کی سبھی نہیں تو اکثر کتابوں سے فائق ضرور ہے اور اس صدی میں لکھی جانے والی خودنوشت سوانح عمریوں میں فائق تر!

اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے مولانا دریابادی کے خط وخال مکمل طور سے اجاگر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، مولانا نے اس کتاب میں اپنے قلم کو ___ جیسا کہ ان کی تحریروں کی پہچان ہے ___ نہ مکمل بے حجاب کیا اور نہ ہی آپ ذات کو مکمل باحجاب، یہ توازن اس آپ بیتی کا نشان امتیاز اور اس کی خصوصی پہچان ہے۔

یہ کتاب ۵۱/ابواب پر مشتمل ہے، جس میں خانگی، اسکولی، کالجی، ازدواجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور علمی و تصنیفی زندگیوں کو منتشر ذیلی ابواب وعناوین کے تحت بڑے سلیقے، توازن اور جامعیت واختصار کے ساتھ نگاہوں کے سامنے لایا گیا ہے۔ جس میں مذہب بھی ہے اخلاقی قدریں بھی، ادب بھی ہے تعمیری اقدار بھی، تنقید بھی ہے طنز ومزاح بھی، ''رفت سامانی'' بھی ہے، حزن آفرینی بھی، بے باکی بھی ہے حق شناسی بھی، سادگی بھی ہے بے ساختگی بھی، ''جذبات واحساسات کی ترجمانی'' بھی ہے، 'واقعات ومناظر کی سادہ تصویر کشی'' بھی، مسرت وشادمانی کے خوشگوار جھونکے بھی ہیں، رنج والم کے درد انگیز نالے بھی، ''اسلامی حمیت کی دیدبانی'' بھی ہے تو ''ملی غیرت کی رجز خوانی'' بھی، الحاد کی کہانی بھی تو اسلام کی طرف بازگشت کی داستان بھی، ایک عہد کی تاریخ بھی ہے تو متاع گمشدہ پر نالۂ وفریاد بھی، کہیں مولانا کے روپ میں ہیں تو کہیں مسٹر کے لباس میں، کہیں ماہر فلسفہ ونفسیات تو کہیں مبصر ونقاد، کہیں بڑوں میں نظر آتے ہیں تو کہیں خردوں میں، کہیں خلوت میں تو کہیں جلوت میں، کہیں محبین ومعتقدین کے جلو میں تو کہیں مخالفین ومعاندین کے ہمراہ، غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے سے جھانکتے ہوئے اور ہر موڑ سے آواز دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان ساری جزئیات کی تفصیلات کون سنائے؟ اور کس کو سنائے؟

تفصیل بعد الاجمال کے بلاغی اصول کے پیش نظر اب جی چاہتا ہے کہ اس آپ بیتی کا ادبی اور تعمیری جائزہ پیش کر دیا جائے۔ لیکن اس سے قبل ایک مفید اور زندگی میں کام آنے والا ''اقتباس'' پیش خدمت ہے جس کا تعلق موضوع اور عنوان سے بہت گہرا ہے۔

برصغیر کے نامور ادیب، محقق اور مشہور طنز ومزاح نگار ڈاکٹر مشفق خواجہ نے اپنے ایک مزاحیہ مضمون ''ورود نامسعود'' میں آپ بیتی لکھنے والوں کے عمومی مزاج -جس سے مولانا دریابادی کی آپ بیتی کلی طور پر مستثنی ہے- کا تجزیہ بڑے مبصرانہ اور ظریفانہ انداز میں کیا ہے، وہ اپنے مخصوص طنزیہ مگر شائستہ ومہذب اسلوب میں لکھتے ہیں:

''آپ بیتی ایک عجیب وغریب صنف ادب ہے جس کا موضوع بظاہر تو لکھنے والے کی اپنی ذات ہوتی ہے، لیکن بحث عموماً دوسروں کے اعمال وکردار سے کی جاتی ہے، لکھنے والے کو اجازت ہوتی ہے کہ ہر اس بات کو پھیلا کر بیان کرے جس کا

اصل موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو اور ہر اس بات کو نظر انداز کردے جس سے اصل موضوع پر روشنی پڑنے کا امکان ہو ......آپ بیتی لکھنے والے اپنا ذکر ایسی عقیدت و محبت سے کرتے ہیں جیسے وہ اپنے خیالات نہیں لکھ رہے ہیں، بلکہ کسی خوش اعمال بزرگ اور محترم ہستی کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں۔اس مقصد کے لئے اپنے شجرۂ نسب میں تبدیلی سے لے کر ہر قسم کے واقعات میں رنگ آمیزی کو جائز سمجھا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں سچائی کا دعوی خود سچائی کا نعم البدل بن جاتا ہے، آپ بیتی لکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اس کے لئے کسی دستاویزی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کی ذات فیض رساں ہی تمام سچائیوں کا سر چشمہ ہے، یہ خود اعتمادی بالآخر بہت سی خرابیوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جن میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ لکھنے والے کے بجائے پڑھنے والے شرمندہ ہوتے ہیں'' (بیسویں صدی میں طنز و مزاح، ص ۲۳۲، ۲۳۱)

مولانا دریابادی کی آپ بیتی کی خصوصیت یہی ہے کہ اس کا پڑھنے والا خیالی دنیا میں پرواز نہیں کرتا بلکہ وہ خرمن حقائق سے اپنے دامن مراد کو بھرتا رہتا ہے تا کہ اسے شرمندگی کا سامنا ہی نہ کرنا پڑے، البتہ کوئی بھی قلم کار اپنی ذات سے الگ نہیں ہو سکتا جبکہ اس کا موضوع خود اپنی کہانی سنانا ہو، اس لئے ایک قاری بھی اسے اس طرح مزہ لے لے کر پڑھتا ہے گویا وہ خود اس کی ''آپ بیتی'' ہے۔

اس آپ بیتی میں ادب و انشاء اور تعمیری اقدار اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا ''لازم ملزوم'' اور ''مبتدا خبر'' کو الگ کرنا ہے، اس لئے ہر نمونہ میں آپ کو دونوں پہلو، پہلو بہ پہلو ہی نظر آئیں گے، چند نمونے پیش خدمت ہیں:

انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ اس کا نفس ''خوبصورت'' چیزوں کی طرف زیادہ مائل رہتا ہے، جبکہ اصل چیز ''سیرت و کردار'' ہے، یہ راز تو ذاتی تجربے کے بعد ہی عموماً کھلا کرتا ہے، مولانا بھی کبھی ''مسٹر'' رہ چکے تھے اس لئے انہوں نے اس پہلو پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اس لئے ایک اقتباس پڑھیے اور مولانا کے حسن انشاء- جس میں تعمیری اقدار کا عنصر کافی مقدار میں موجود ہے- کی داد دیجئے، مولانا لکھتے ہیں:

''بی بی کی شکل و صورت کا سوال، شادی پر چند سال گزر جانے پر کچھ زیادہ اہم نہیں رہ جاتا، درجۂ ثانوی پر آجاتا ہے، ناک نقشہ ہر جوان عورت کا مرد کے جذبۂ شوق کو تسکین دینے کے لئے کم بیش یکساں ہی ہوتا ہے، فطرت کہنا چاہیے کہ ہر جوان عورت کے چہرے پر ماء الشباب کا غازہ مل کر اسے مرد کے لئے قبول صورت بنا ہی دیتی ہے، اور اکیلا چہرہ کیا معنی اس کی ساری ہی جسمانی ساخت کا تقریباً یہی حال ہے، سابقہ پڑنے پر خصوصاً ہمہ عمری اور ہر جہتی سابقہ پر صورت سے کہیں بڑھ کر سیرت کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، اور سیرت کا مفہوم بڑا وسیع ہے، رہنے سہنے کے سارے رنگ ڈھنگ، اور حسن معاشرت کی ساری صوتیں اس کے اندر آگئیں .... مسلمان گھرانے کی خاتون کو جنت جیت لینے کے لئے بہت زیادہ نفل نمازوں اور عبادتوں ریاضتوں کی ضروت ہی نہیں، بس فرض عبادتوں کے بعد بچوں کو ٹھیک طرح پرورش دے دینا، اور اپنے سابقہ والوں کے حق ادا کر کے ان کو راضی رکھنا یہ خود کسی مجاہدے سے کم نہیں'' (آپ بیتی ص ۱۸۷، ۱۸۶، ۱۸۵)

وصف نگاری اور منظر کشی بھی ہر کسی کا روگ نہیں، بلکہ اس کے لئے منظر نگار کا مشاق قلم کار اور کیفیات و جذبات، اور تجربات و مشاہدات کو مؤثر اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ہونا از حد ضروری ہے، تا کہ جس منظر کی وہ تصویر کشی کر رہا ہے وہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور ذہن کے پردۂ سیمیں پر ابھر جائے، اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو مولانا دریابادی کے قلم کو چوم لینے کو جی چاہتا ہے، چند نمونے اس کے بھی ملاحظہ فرمائیں:

ریل کے پہلے سفر کی منظر کشی ملاحظہ ہو، مولانا لکھتے ہیں:

''ریل کا پہلا سفر اسی زمانہ کا یاد ہے، ریل کے سفر کی خوشی کا اس سن میں کیا کہنا، چھوٹے بڑے اسٹیشن کے آنے کی خوشی، گاڑی کی ہر نقل وحرکت سے دلچسپی، گارڈ، ڈرائیور، ٹکٹ چیکر، اسٹیشن ماسٹر، ہر وردی پوش کی شکل میں دل کشی، ٹرین کے ہر پٹری بدلنے کے وقت جوشِ مسرت، نہ کسی تکلیف کا احساس، نہ کسی ہجوم وریل پیل سے کوئی خوف وہراس، بس کھڑکی کے پاس بیٹھ، باہر جھانکنا اور خشک وتر منظر سے بسی خوشی محسوس کرنا۔ آج اس سادہ ذہنیت، طبعی معصومیت کو واپس بلالینا، کاش کسی قیمت پر بھی ممکن ہوتا!'' (ایضاص/۶۹)

ریل ہی کے سفر کے ضمن میں بچپن کی شوخیوں، شرارتوں اور بے فکریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''چھوٹوں کو ان مصلحتوں اور دور اندیشیوں سے کیا سروکار، یہاں تو خوشی اور بے انتہا خوشی اس کی کہ ریل پر بیٹھنے کا موقع ملے گا، نئے نئے اسٹیشن دیکھنے میں آئیں گے.....ساری خوشی اس ہنگامے اور ہلڑ کی تھی، سفر کی ساری فکریں اور انتظامات تو بڑوں کے سر تھے، اپنے حصہ میں محض ہلڑ بازی آئی، یہ چیز توڑی وہ پھوڑی، ایک اودھم مچا کر سارا گھر سر پر اٹھالیا.....آج یہ ساری شوخیاں، شرارتیں، جس درجہ نامعقول نظر آرہی ہوں، اس سن میں قوت کا فاضل یا فالتو ذخیرہ جو جسم میں فاطر کائنات کی طرف سے جمع رہتا ہے، وہ آخر اپنی نکاس کا راستہ اور کس طرح ڈھونڈتا! توڑنا معقول ہی سرتاسر ان حرکتوں کو کیوں کہیے! اور ان سے شرمندگی ہی اتنی کیوں محسوس کیجئے، ذکر کرتے کرتے کچھ رشک سا بھی تو اپنی اس معصومیت، سادہ دلی، خام عقلی اور بے تصنع نادانیوں پر آگیا!

کم فہم تھے تو کم تھے پریشانیوں میں ہم
دانائیوں سے اچھے تھے نادانیوں میں ہم!''

(ایضاص ۷۱، ۷۲)

رسم ''بسم اللہ'' - جو اس دور میں مسلمان شرفاء کی پہچان اور اسلامی تہذیب کی ایک برکت تھی - کی تصویر کشی کے ذیل میں ''دایہ'' کی گود میں جانے کی کیفیت کو جس مؤثر پیرایہ بیان میں بیان کیا ہے وہ ادب وانشاء پردازی کے ساتھ ساتھ سادگی وبے ساختگی کا بھی شاندار نمونہ ہے، مولانا کا سحر نگار قلم اپنا جادو یوں جگاتا ہے:

''ہائے وہ دایہ کی گود میں جانے کی لذت اب کیا بیان ہو؟ وہ لذت جس کا بدل نہ کبھی جوانی کی گرمیاں دے سکیں، نہ کبھی بڑھاپے کی خنکیاں!.. پڑھنے والے اس مقام پر پہنچ کر ایک پیر نابالغ پر ہنستے اور مضحکہ کرنے میں جلدی نہ کریں، عجب نہیں کہ اس سن پر پہنچتے پہنچتے انہیں بھی بچپن کی پیاری معصومانہ شرارتوں کی یاد تازہ ہوجائے!..غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرعہ میں ؎

دو دن کو اے جوانی، دیدے ادھار بچپن!'' (ایضاً ص ۶۲)

اپنی علمی دانشگاہ سے محبت انسان کی فطرت ہے، اور کیوں نہ ہو جب کہ ایک طالب علم کی زندگی کا زرخیز اور شاداب حصہ اسی میں گذرتا ہے، لہذا اس سے محبت کا ہونا اور جدائی کا ہونا اور جدائی میں دل کا صد پارہ ہونا ایک فطری تقاضہ ہے، دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مولانا دریابادی کی یہ تحریر پڑھیے اور انہیں خراج عقیدت پیش کیجئے:

''.....اسی سیتاپور ہائی اسکول میں عمر کے چھ سال یکلخت گزرے.....لڑکپن یہیں کھویا، نوجوانی یہیں پائی، جب داخل ہوا ہوں تو دسویں سال میں تھا جب چھوڑا ہے تو سولہواں سال تھا، سبزۂ آغاز بلکہ مونچھیں خاصی نمایاں - آہ، قلم سے ابھی یہ کیا کیا نکل گیا؟ دسواں سال؟ اور سولہواں سال؟ کبھی یہ سن بھی آج کے پیر فرتوت کا رہ چکا ہے؟ نہیں نہیں، یہ سن کبھی اپنا کیا رہا ہوگا؟ ہاں کبھی یہ خواب دیکھ لیا ہوگا؟ کاش اس خواب سے جاگنا ہی نصیب نہ ہوتا! کتنی بھولی بسری یادیں ان سطروں کی تحریر کے وقت تازہ ہوگئیں، کیسی کیسی حسرتیں، کیا کیا تمنائیں زندہ ہوا ٹھیں، کیا

معصومیت تھی، کیسے بھولے پن، کس بے خبری کا زمانہ تھا، دنیا اس وقت کیسی رنگین، کتنی پر بہار، کتنی دل فریب نظر آرہی تھی! ؎

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

شوخیاں تھیں تو معصومانہ، شرارتیں تھیں تو طفلانہ، قلب میں کہاں تھی، یہ قساوت اور کہاں تھیں فسق کی یہ گہری چھاپیں! -کاغذ پر اب نقوش کو کوئی کیسے کردے! وہ تو صرف تمام تر اعمال کے کاغذ پر فرشتوں ہی کے قلم سے ثبت ہیں، محبت اس اسکول کی عمارت سے، کلاس سے در و دیوار سے فیلڈ سے، اس کے چھٹنے سے سالہا سال تک باقی رہی، جوانی بھر باقی رہی، اور بالکل تو اب بھی کب مٹی ہے؟

دوسرا رخ! ''مارچ ۱۹۰۸ء کی کوئی اخیر تاریخ ہوگی اور اسکولی حاضری کا بالکل اخیر دن کہ سہ پہر کے وقت ہمارا کلاس آخری بار اکٹھا ہوکر اسکول کے ہر کلاس اور ہر ماسٹر سے رخصت ہونے نکلا، وہ مؤثر منظر مدتوں تازہ رہا اور اس کا دھندلا سا نقش آج بھی موجود ہے، جدائی اور رخصتی کا کوئی منظر مؤثر نہیں ہوتا؟ جو اسکول مہینے دو مہینے نہیں، چھ سال تک اپنا گھر بنا رہا تھا، اب اس میں آنا بیٹھنا، کبھی نصیب نہ ہوگا، ساتھیوں کے مل بیٹھنے، ہنسنے بولنے کا آج آخری دن ہے! بالکل آخری دن! چھ سال اس سن کے پیمانۂ زماں کے لحاظ سے، بیس سال کے برابر تھے، اور اتنے سال گزرے بھی کس طرح تھے! رو دھو کر، منہ بسور کر نہیں، پریشانیوں اور فکرمندیوں کے ساتھ نہیں، خوب آزادیوں کے ساتھ، پوری بے فکریوں کے ساتھ، انتہائی زندہ دلی کے ساتھ، آج جدائی اسی اسکول سے ہو رہی تھی، چپہ چپہ اس کا عزیز ہوگیا تھا، گوشہ گوشہ اس کا دل و دماغ میں رس بس گیا تھا! دل کیسے نہ مسلتا، قلق کیسے نہ ہوتا! - کون اس وقت بتاتا کہ اے غافل، نادان چھوکرے! ابھی تجھ پر گزری ہی کیا ہے؟ ابھی تو زندگی کی عمارت کی چوکھٹ پر تو نے قدم رکھا ہے، ابھی تو کتنے درد و قلق، کتنے رنج و صدمے، کتنی مایوسیاں اور حسرتیں، قسمت میں قدم قدم پر لکھی ہوئی ہیں، اور اس ناسوتی زندگی کے ختم پر جو دھڑکا اور اندیشہ "ولعذاب الآخرة أكبر" کا لگا ہوا ہے، اس کا کوئی ذکر ہی نہیں!'' (ایضاً ص ۱۰۳/۱۰۲، ۹۷، ۹۶)

بچوں کی طبیعت و مزاج پر ماحول کا اثر پڑنا ایک قدرتی امر ہے اور نفسیات کی ایک مسلمہ حقیقت بھی! اچھے ماحول کردار ساز بھی ہوتے ہیں اور رجال ساز بھی! جبکہ گندے ماحول، اخلاق سوز، حیا سوز بلکہ ایمان سوز ثابت ہوئے ہیں، اس کی واضح مثال خود مولانا دریابادی کی شخصیت ہے، مولانا کا نشو ونما جس ماحول میں ہوا وہ دینی اور روحانی تھا اور اسلامیت کی چھاپ بہر حال اس پر تھی، لیکن جب آپ نے اس ماحول سے نکل کر دوسرے ماحول یعنی کالجی زندگی میں قدم رکھا- جہاں کی زندگی عموماً ''الحاد'' کا شکار رہتی ہے- تو وہی اسلامیت جس پر آپ کو ناز تھا اور جو آپ کے آباء واجداد کی گویا میراث تھی ''عقلیت'' میں تبدیل ہوگئی جو درحقیقت ''الحاد و ارتداد'' کا پیش خیمہ بنی، گو اس دور الحاد میں اسلامی روایات سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن اسلامی جذبات ہمیشہ آپ کے سینے میں موجزن ہی رہے جس کا وقتاً فوقتاً اظہار ہوتا رہا، اس پہلو پر بھی مولانا دریابادی نے بڑی بے باکی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جو ایک آپ بیتی لکھنے والے کے لئے ضروری تھا، مولانا رقمطراز ہیں:

''اپنی ''عقلیت، الحاد و تفلسف'' کے باوجود سوشل حیثیت سے مسلمان اب بھی بدستور رہا، وضع ولباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، بالکل مسلمانوں کا سا، اور ملنا جلنا سب مسلمانوں ہی کے ساتھ، دین اسلام چھوڑ دیا تھا، لیکن اسلامی تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت نہ چھوڑ سکا، اور اسلام سے ارتداد کے باوجود کسی دوسرے مذہب یا اس کے عقائد سے لگاؤ ذرا نہ پیدا ہوا، بلکہ ملتِ اسلامی کے شعائر (مثلاً گوشت خوری) کی تو تقریر و تحریر میں حمایت ہی کرتا رہا..... عقلی تعلق تمام تر منقطع ہوجانے کے بعد جذباتی تعلق اسلام سے قائم رہا- ''دین اسلام'' کی غیرت و

حمیت کا تو خیر کہنا ہی کیا، لیکن مسلم قومیت کی غیرت وحمیت بھی ایسی چیز نہیں کہ ہنسی اڑائی جائے'' (ایضاً ص ۱۳۱، ۱۳۰)

قلم کے اندر اللہ تعالیٰ نے زبردست طاقت رکھی ہے اور- متضاد صفات بھی، اگر یہ آلۂ تعمیر ہے تو آلۂ تخریب بھی، گویا یہ دو دھاری تلوار کی مانند ہے، اس کا صحیح استعمال ہو تو مثبت اور تعمیری نتائج پیدا ہوتے ہیں، لیکن جب یہی شیطانی ہاتھوں کی زینت بنتا ہے تو تمام تر اخلاقی قدروں اور معاشرتی ضابطوں کو توڑ کر اپنی آورگی دکھانے میں ذرا بھی نہیں لجاتا -مولانا دریابادی کی زندگی میں سب سے بڑا حادثہ جو پیش آیا وہ ''الحاد وارتداد'' کا ہے، وہ قلم کے ذریعہ ہی پیش آیا تھا-مولانا اپنی سن کے سولہویں سال میں تھے کہ ایک کٹر ملحد ڈاکٹر ڈریسڈل (Dyresdale) کی ایک کتاب - جو درحقیقت اصول معاشرت اور آداب معاشرت پر تھی، مذہب سے اس کا تعلق کچھ بھی نہ تھا- Elements of Social Science ہاتھ لگی، پڑھتے ہی مولانا ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور اسلام کی عظیم دولت ارتداد کے ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی، کتاب کیا تھی، بقول مولانا دریابادی:

''ایک بارود بچھی ہوئی سرنگ تھی، حملہ کا اصل ہدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں، جنہیں مذہب کی دنیا اب تک بہ طور علوم متعارفہ کے پکڑے ہوئے ہے اور ان پر اپنے احکام کی بنیاد رکھے ہوئے ہے، مثلاً عفت وعصمت، کتاب کا اصل حملہ انہیں بنیادی اخلاقی قدروں پر تھا، اس کا کہنا تھا کہ یہ جنسی خواہش تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے، اسے مٹاتے رہنا، اور اس کے لئے باضابطہ عقد کا منتظر رہنا نہ صرف ایک فعل عبث ہے، بلکہ صحت کے لئے اور جنسی قوتوں کی قدرتی بالیدگی کے لئے سخت مضر ہے .....انداز بیاں بلا کا زوردار اور خطیبانہ تھا، سولہویں سال کا ایک طفل ناداں اس سیلاب عظیم میں اپنے ایمان واخلاق کی ننھی منی سی کشتی کو کیسے صحیح وسالم رکھ پاتا! خصوصاً جب کہ کتاب کی دعوت ودعایت عین نفس کے مطابق ہو- مذہب کی حمایت و نصرت میں اب تک جو قوت جمع کی تھی وہ اتنی شدید بمباری کی تاب نہ لاسکی، اور شک و بدگمانی کی تخم ریزی مذہب و اخلاقیات کے خلاف خاصی ہوگئی۔ آگے مزید لکھتے ہیں:

''پروپیگنڈہ کا کمال بھی یہی ہے کہ حملہ براہ راست نہ ہو، بلکہ اطراف وجوانب سے گولہ باری کر کے قلعہ کی حالت کو اتنا مخدوش بنا دیا جائے کہ خود دفاع کرنے والوں میں تزلزل و تذبذب ہو جائے، اور قدم ازخود اکھڑ جانے پر آمادہ ہو جائیں''

مولانا دریابادی کا ایک مشورہ- جو ایک مبتلی بہ اور ڈسے ہوئے شخص کا مشورہ ہے- بھی ذہن میں رکھئے اور دیدۂ عبرت وا کر کے اس عبارت کو پڑھئے، مولانا ارقام فرماتے ہیں:

''ہر مسلمان کے لئے کتاب کا یہ حصہ بڑے غور وفکر، عبرت وبصیرت سے پڑھنے کے قابل ہے، دین کے آغوش میں پلا ہوا، بڑھا ہوا لڑکا بلکہ نوجوان شیطان کے پہلے ہی دوسرے حملے میں یوں چت ہو گیا، گمرہی کے کتنے دروازے ہیں، اور شیطان کی آمد کے لئے کتنے راستے کھلے ہیں!'' (ایضاً ص ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵، ۲۳۴)

یہ تفصیل اس لئے سنائی گئی تا کہ: ''ایمان کو عزیز رکھنے والے خدا کے لئے ان تصریحات کو غور سے پڑھیں، اور کچھ لمحے سوچیں کہ جس تعلیم کے آتش کدے میں وہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بے تحاشہ جھونک رہے ہیں وہ انہیں کدھر لے جانے والی ہے!'' (ایضاً ۲۴۱/)

شادی اور نکاح اور ازدواجی زندگی کا تذکرہ بھی بڑا لطف اندوز اور لذت اندوز ہوتا ہے، وہ نوجوان ہی کیا جس کے سامنے ''شادی'' کا ذکر کیا جائے اور اس کے جذبات و احساسات کے سمندر میں تلاطم پیدا نہ ہو؟ کون ایسا جوان رعنا بلکہ پیر فرتوت ہوگا جس کے سامنے یہ ''چار حرفی'' لفظ کا تذکرہ ہو اور اس کے چہروں اور مکھڑوں پہ بے پناہ لمعانی نظر نہ آئے؟

جس کے سینوں میں تمنائیں انگڑائیاں نہ لینے لگیں؟ اور جس کے ارمانوں اور خوابوں کا شیش محل تیار نہ ہو جائے؟

قربان جایئے مولانا دریابادی پر کہ انہوں نے اس پر مسرت موقعہ پر بھی آپ کو فراموش نہیں کیا، اور اپنی ازدواجی زندگی سے متعلق اپنی اس چھوٹی سی کتاب میں کئی ابواب باندھ ڈالے اور پڑھنے والے باذوق حضرات کے لئے قیمتی اور زریں اصول وضع کر گئے، اس موضوع پر قلم، وہ بھی مولانا دیابادی جیسے سحر نگار اور معجزانہ اسلوب کے مالک صاحب طرز ادیب اور ماہر انشاء پرداز کا، کیا کیا گل بوٹے کھلا سکتا ہے، اس کا صحیح اندازہ تو اس چمن میں گل گشتی کرنے والے خوش نصیب افراد ہی کو ہو سکتا ہے۔ مولانا دریابادی کا قلم جیسے یکا یک جوان اور سدا بہار ہو گیا ہو، اس لئے ذرا شوخی، بے باکی، شرمیلی نہیں بلکہ بے حجابی کا انداز اپنے اندر رکھتا ہے، لیکن اتنا شتر بے مہار نہیں کہ تہذیب نگارش کے خلاف ہو اور کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جسے بے لباس کرنے کی گھناؤنی حرکت کی گئی ہو، یہ بھی مولانا دریابادی کے زبان و بیان پر قدرت کی دلیل ہے، ورنہ ایسی تحریر لکھتے وقت مشاق قلم کار بھی اپنے عنان قلم کو باگ میں نہیں رکھ پاتے جس کے نتیجے میں وہ سب کچھ لکھ ڈالتے ہیں جو شیوۂ حزم واحتیاط کے خلاف تو ہوتے ہی ہیں، سفلی جذبات کو متحرک کرنے والے بھی!

اس تمہید کے بعد مولانا کی ایک تحریر پڑھئے اور لطف لیجئے، ہونے والی اپنی شریک حیات سے ایک ملاقات – جو اضطراراً ہوئی – کے بعد مولانا جس کیفیت سے دو چار ہوئے، اس کی عکاسی مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو، مولانا لکھتے ہیں:

''نوجوان قبول صورت لڑکی کی مسکراہٹ اور اس پر مسرت آواز میں جادو کا اثر تھا، مریضہ کا چہرہ آناً فاناً معالج کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا! – وہ میری مریضہ تھی، اتنی ذرا سی دیر میں ''کچھ اور'' – اس ''کچھ اور'' کی معنویت کے اندازہ لگانے کے لئے اس کے بین السطور میں بس جھانکتے رہیے – بن گئی تھی، اور معالج اب خشک معالج نہ رہا خود علاج طلب مریض سا بن گیا!

شکار کرنے کو آئے شکار ہو کر چلے!

شاعری نہیں اب واقعہ تھا، کہاں تو آنے میں یہ پس وپیش، تکلف وحجاب تھا، اور اب کہاں اٹھنے میں طرح طرح کی بہانہ بازیاں اور حیلہ سازیاں!'' (ایضاً ص ۱۶۱-۱۶۰)

ایک موقعہ پر لکھتے ہیں جس سے مولانا کے اضطراب و اشتیاق اور شرم وحیا دونوں کا پتہ چلتا ہے:

''پردہ ضابطہ سے – اشارہ اپنی منسوبہ اور مخطوبہ کی طرف ہے – تو پورا پورا تھا، لیکن چوری چھپے سامنا کبھی کبھی ہو ہی جاتا، اشتیاق ادھر سے تو ظاہر ہی تھا، اجتناب ادھر سے بھی کامل نہ تھا'' (ایضاً ص ۱۷۲)

''یہ تھا اس وقت شریف گھرانوں میں شرم وحیا کا معیار! اور شرم وحیا بھی کسی لکیر کے فقیر کی نہیں، مجھ ''روشن خیال'' و'' آزاد مشرب'' کی!''۔ (ایضاً ص ۱۶۳)

مولانا کی شادی کی منظوری جب ان کی منسوبہ کے سرپرستوں کی طرف سے آئی اور شادی کی تاریخ مقرر ہوئی، اس وقت مولانا کی جو کیفیت تھی وہ دیدنی تھی، خود مولانا لکھتے ہیں:

''بہر حال منظوری خدا خدا کر کے آئی، اور اس دن کی مسرت کا پوچھنا ہی کیا! دل بہ قول شخصے بلیوں اچھل رہا تھا، اور محسوس یہ ہو رہا تھا جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آ گئی ہے!

بارے ہوئی قبول بڑی التجا کے بعد

حالؔی کا یہ مصرعہ ورد زبان تھا..... آج سے بڑھ کر مسرت کا دن زندگی بھر میں یاد نہیں پڑتا، ایک نشہ سا سوار تھا، خوشی سے اچھلا ابلا پڑتا تھا، کوئی فاتح بڑے سے بڑا ملک بھی فتح کر کے اس سے زیادہ نازاں ومسرور کیا ہوگا، جتنا میں آج تھا!'' (ایضاً ص ۱۷۶، ۱۶۹)

شادی والا مہینہ بہت پیارا ہوتا ہے اور خاصہ رنگین اور لذت اندوز بھی، مولانا بھی بہر حال اس وقت ''مولانا'' نہیں ''مسٹر'' تھے وہ بھی آزاد خیال، اس لئے مولانا کی اس عبارت کو کہ ''جون کا سارا مہینہ ٹھیٹھ ہندوستانی قسم کے 'ہنی مون' میں گزرا'' پڑھکر

اچنبھا نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ''نوجوانی کا سن یوں ہی حماقت اور ناعاقبت اندیشی کا ہوتا ہے، اور پھر جب محبت کا جنون بھی شامل ہوجائے''، چنانچہ مولانا جیسے ''مسٹر'' پر بھی ایک وقت ایسا آیا کہ ان کا سارا خمار اتر گیا، اور انہیں اندازہ ہوگیا کہ:

''بیوی گل اندام و پری روش سہی، ہمیشہ بزم عشرت کی تصویر اور بستر کی تفریح ہی بن کر نہیں رہ سکتی، اسے گھر کی منتظم اور بچوں کی ماں ہوکر بھی رہنا ہے'' (ایضاً ص/۱۸۳)

سن وسال کے اثرات بہرحال انسان پر پڑتے ہیں، اسے روک دینا کسی بشر کے بس میں نہیں ''جوانی بڑھاپے'' کے اثرات (جو کہ طبعی اور قدرتی ہیں) سے کون مستثنی ہوتے ہیں کہ مولانا دریابادی اس کلیہ سے مستثنی رہتے؟ لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ سن کے ساتھ نہ وہ رنگ و روغن قائم رہ سکتا تھا، نہ وہ چہرہ کی آب وتاب، نہ وہ قد وقامت کی رعنائیاں، نہ وہ زلف وکاکل کی سیاہیاں، نہ وہ شباب کی رنگینیاں، لیکن یہ ''ظاہر'' اس وقت کہاں تھا؟ اتنی موٹی سی بھی حقیقت اس وقت روشن وعیاں کس پر تھی؟ ''ظاہر ہے'' کا لفظ تو قلم پر آج آرہا ہے، جب اس دور کو نصف صدی سے زائد گزر چکا، جب اپنا سن ۷۵ ویں سال کو پہنچ گیا، اور جب وہ ۱۶ء کی نئی نویلی ۷۱، ۷۲ کے لپیٹے میں آچکی! - یہ اور بات ہے کہ اڑے ہوئے رنگ وروپ، جھریوں پڑے ہوئے چہرے، مرجھائے ہوئے رخساروں، دھنسی ہوئی آنکھوں، گرے ہوئے دانتوں، بھاری بلغمی جسم، نقرس زدہ ٹانگوں والی خاتون، آج بھی میری نظر میں محبوبہ ہی بنی ہوئی ہے، ۷۰، ۷۲ سال کی بوڑھی محبوبہ! آج کہاں ہے اس کی وہ خوبی وزیبائی، رعنائی وشادابی! لیکن نور عصمت سب سے بڑھ کر، سب پر مقدم، سب سے فائق!

حسن ہے بے وفا بھی فانی بھی
کاش سمجھے اسے جوانی بھی''

(ایضاً ص/۱۸۴، ۱۸۳)

اولاد سے محبت ایک فطری شے ہے، اولاد کا سلسلہ جاری رہنا بھی ''نعمت الٰہی'' ہی ہے، گو اس روشن خیال دور میں ''تہذیب حاضر کی تجلی'' کی تاب نہ لاکر اکثر افراد اس ''عظیم رحمت ونعمت'' کو زحمت اور مشقت سمجھ رہے ہیں، گویا مغربی تہذیب وتمدن نے سرے سے اس کے ''عظیم نعمت'' ہونے کا تو کیا ''نعمت اور رحمت'' ہونے کا تصور بھی ہمارے ذہن و دماغ سے نکالدیا ہے، اللهم احفظنا من ذلك۔

۳۳ء تک مولانا کے یہاں اولاد کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا اور ہمیشہ کے لئے اس ''عظیم نعمت'' سے محروم ہوگئے، مولانا نے اس دور کی کیفیات کو الفاظ وتعبیرات کا عمدہ پیراہن بخشتے ہوئے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے:

''ہائے! اب کبھی وہ زمانہ لوٹ کر نہ آئے گا، اب نہ کبھی حمل کی خبر سننے میں آئے گی، نہ کبھی زمانہ حمل کی احتیاطیں ہوں گی، نہ کبھی وضع حمل کا انتظار، نہ کبھی زچہ خانہ کی تیاریاں اور اہتمام، نہ کبھی ہوشیار قابلہ یا لیڈی ڈاکٹر کی تلاش ہوگی، اور نہ کبھی زچگی کے قبل و بعد کی خاطرداریاں اور خوشیاں! ہر ہر جزئیہ ان میں سے ہمیشہ کے لئے گیا، اور اب کبھی نہیں آئے گا! - عورت کا حسن وشباب بھی دنیا کی ہر مادی نعمت کی طرح کتنا عارضی، زودفنا، پرفریب ہوتا ہے، اور اپنے ایک گمنام شاعر دوست امیر علی رقم لکھنوی مرحوم نے کتنا سچا مضمون باندھا ہے۔

تھی یہ حقیقت مجاز، اب یہ کھلا ہے جاکے راز
سب ہے فریب آب وگل، حسن وجمال کچھ نہیں

(ایضاً ص/۳۶۸)

مولانا دریابادی چونکہ ایک ماہر نفسیات تھے، اس لئے اس کتاب میں جابجا نفسیاتی حقائق سے بھی پردہ ہٹاتے چلے گئے ہیں، جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، چنانچہ ایک موقع پر بڑے پتے کی بات لکھی ہے:

''انسان زبانی دعوے عشق ومحبت کے جو کچھ بھی کرڈالے،

حقیقت میں وہ سب سے بڑا عاشق خود اپنے نفس کا ہوتا ہے، اپنی مرضی کو کسی کے تابع نہیں، سب پر بالا ہی رکھنا چاہتا ہے، جہاں کسی کی طرف سے بھی مزاحمت اپنی خواہش نفس کی پیش آگئی، سارے دعوے عشق ومحبت کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں، طوفان غیظ، ہیجان غضب سے مقابلہ کی قوت اگر کسی چیز میں ہے تو صرف خوف خدا میں ہے- یہ بات سب کے کام کی اور بڑے تجربہ کی لکھ رہا ہوں، اپنے اوپر خوب بیتی ہوئی، اور اسے خوب بھگتے ہوئے۔

من نہ کردم شما حذر بہ کنید'' (ایضاً ص/۱۸۹)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''محبت اور دل لگاؤ اور چیز ہے، اور ''نیچر کی طلب'' یا طبعی ضرورت بالکل دوسری، غالبؔ کا مقطع نری شاعری نہیں، ایک گہری نفسیاتی حقیقت کا ترجمان ہے۔

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے''

(ایضاً ص/۱۹۱،۱۹۰)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کتاب میں موقع بہ موقع ذاتی اور اجتماعی زندگیوں کے تجربات بھی بیان کئے ہیں، ان تجربات پر جس قدر غائرانہ نظر ڈالیں گے، اسی قدر ان کی افادیت ونافعیت کے تہ بہ تہ پردے آپ کی نگاہوں سے اٹھتے چلے جائیں گے، وہ ضرور آپ کے لئے ''چراغ راہ'' اور ''راہ عمل'' ثابت ہوں گے، ان تجربات کے چند حصے پر آپ بھی نگاہ ڈالتے چلیں، ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

''طبعی تقاضہ وشوق اور چیز ہے اور ہوس اور چیز، بقول حضرت اکبرالہ آبادی۔

کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں
جو فرق کہنے اور بکنے میں ہے وہی فرق طبعی تقاضے اور ہوس میں ہے۔
وہ راہبر کی ہدایت، یہ رہ گزر کا فریب

طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے، لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لئے کوئی حد ونہایت نہیں''

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ ہوا ہے، ہر نفس پرستی، ہر ہوسنا کی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضرر وزیاں کی کوئی خوبصورت سی تاویل وتوجیہ ہر بار کرے گا، اور "ھل من مزید" کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رکھے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھئے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہئے''۔

مزید لکھتے ہیں:

''غصہ اور شہوت، یہ نفس کے دو پناہ حربے ہیں، اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نوعمری ہی میں قابو پالیا گیا، انہیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے، ورنہ اگر یہ سنپولے بڑھ کر اژدہے ہوگئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی''

ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''دل کو ریا ونمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان ومعمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت ہاتھ آسکتی ہے، اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے، ولا یلقاھا إلا ذو حظ عظیم"— راہ اخلاص کا سب سے بڑا راہزن، مداحوں معتقدوں اور مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد وتحسین، رضا جوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے''۔

ایک بات بڑے پتہ کی لکھی ہے کہ:

''روپیہ کی محبت اور شے ہے اور اس کی قدر اور، روپیہ کی محبت تو بے شک ہرگز نہ پیدا ہونے پائے، لیکن روپیہ کی قدر ضرور ہو، یہ نہ ہو تو دوسرا مرض اسراف کا پیدا ہو کر رہے گا، بخل و اسراف دونوں مرض ایک ہی درجے کے ہیں اور دونوں بڑے

سخت-ان کے حملے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی واحد صورت یہ ہے کہ قلب کو ایک طرف حب مال سے خالی رکھا جائے، اور دوسری طرف روپیہ کی ناقدری سے''

ایک پرزور وصیت بھی مولانا کی دیکھتے چلیں جو مولانا نے بڑے ہی تلخ تجربوں اور خوب ہی ٹھوکریں کھانے کے بعد ناظرین وقارئین سے کی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

''دنیا سے دل ہرگز نہ لگائیں، اور اس کے مکروفریب میں نہ آئیں جس کے صدہا چہرے اور بے شمار نقابیں سہی لیکن بہرحال جسم و جسد کے ساتھ ہی اس خاکدان میں بھیجا گیا ہے، اس حکمت کی رعایت رکھنا لازمی ہے، دنیا کو برتئے مگر دل نہ لگایئے، دل تو آخرت ہی سے لگائے رہئے، اکبر ہی کے لفظوں میں:

غافل نے ادھر دیکھا، عاقل نے ادھر دیکھا''

(ایضاً ص ۳۸۰، ۳۷۸، ۳۷۷، ۳۷۶)

مولانا دریابادی نے اس کتاب میں چند شخصیات کا بھی مختلف عنوانوں سے تذکرہ کیا ہے، ان میں معاصرین بھی ہیں، بزرگان دین بھی، بڑے بھی ہیں چھوٹے بھی، عظیم بھی ہیں عزیز بھی، محسنین بھی ہیں معتقدین بھی، محبین بھی ہیں مخالفین و معاندین بھی، ان لوگوں کا بھی تذکرہ ہے جن سے کسی طرح بھی مولانا متأثر ہوئے، جن میں معمولی لوگ بھی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی میں چھوٹے اور بڑے کی تقسیم کچھ زیادہ معین و مددگار اور مؤثر ثابت ہوئیں ان کا تذکرہ، مولانا کی زبانِ قلم ہی سے سنئے، سبھی شخصیات کے احسانات و اعترافات کے بعد لکھتے ہیں:

''سب کے احسانات اپنی جگہ پر، لیکن حقیقتاً میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ معین و مؤثر دو شخصیتیں ثابت ہوئیں، ان دونوں نے کہنا چاہیئے کہ زندگی کا رخ ہی موڑ دیا، ان دونوں کا فیضِ صحبت نہ نصیب ہوتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔

پہلا نام تو ہندوستان کے مشہور لیڈر ''مولانا محمد علی'' کا ہے، یہ میرے گویا محبوب تھے، زبان و دماغ پر ان کی اخلاقی و روحانی عظمت کا کلمہ رواں تھا، اور ان کی ذات سے شیفتگی درجہ عشق تک پہنچ چکی تھی..... ان کی نہ کوئی بات دل کو بری لگتی، نہ ان پر کسی حیثیت سے بھی تنقید کرنے کو جی چاہتا، یہی جی میں رہتا تھا کہ ان کے قلم اور ان کی انگلیوں کو چوم چوم لوں، اسلام اور رسولِ اسلام سے اس درجہ شیفتگی، اللہ کے وعدوں پر اس شدت سے اعتماد، یہ اخلاص، یہ للّٰہیت، تصنع و منافقت سے اس درجہ گریز، حق کے معاملے میں عزیزوں، قریبوں، بزرگوں تک سے بے مروتی اور پھر ایسی فہم و ذکا، علم و آگہی، غرض میرے لئے تو ایک بے مثال شخصیت تھی، اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دوسری شخصیت ان سے بھی اہم تر اور مفید تر جو میرے نصیب میں آئی، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی..... جب مراسلت کے بعد نوبت دید و زیارت کی آئی، تو کتنے ہی کمالات ظاہری و باطنی کھل کر رہے، علم و تفقہ تصوف و شریعت کے جامع حسن عمل کے ایک زندہ پیکر، اور ارشاد و اصلاح کے فن کے تو بادشاہ- وقت کے دوسرے مشائخ کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی،

تو بہار عالم دیگری، زکجا بہ ایں چمن آمدی!

شیخ سعدیؒ اگر آج ہوتے تو عجب نہیں کہ نسخۂ گلستاں بہ غرضِ اصلاح ان کی خدمت میں پیش کرتے، حضرت غزالیؒ ہوتے تو عجب نہیں کہ ''احیاء علوم الدین'' کی تصنیف میں استناد و استفادہ ان سے سطر سطر پر کرتے رہتے ..... بزرگ اور عابد زاہد بزرگ اور متعدد دیکھنے میں آئے، لیکن مصلح، مزکی، مربی کوئی ایسا دیکھنے میں نہ آیا- محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو اشرف علی میرے مقتدا و مطاع، محبت کے مرکز اگر وہ تھے، تو عقیدت کے مرجع یہ!'' (ایضاً ص ۳۵۹، ۳۵۸، ۳۵۷)

اس آپ بیتی میں کثرت سے تعمیری اور اخلاقی اقدار چمکدار ذروں کی طرح بکھرے اور چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں جن سے ہم اور آپ زندگی کے اندر بہت کام لے سکتے ہیں، ایک جگہ خدمت گاروں کی حق تلفی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ جواز پر بھی لطیف پیرائے میں خوب روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

''نوکر چاکر اگر محض اجیر ہوں، یعنی باہر کے ہوں تو ان کی محنت کا معاوضہ محض نقد و جنس انہیں دے دینا تو معاملہ پھر بھی غنیمت ہوتا ہے، ہمارے ہاں بڑی تعداد خانہ زادوں، یعنی گھر کے پروردوں کی تھی...... ایسوں کے حق وحقوق عام خدمت گاروں سے دس گنے بڑھ کر ہوتے ہیں، ان کے حقوق پورے تو خیر کیا ادا ہوتے، اس کا چوتھائی بھی اگر ہوئے ہیں تو بھی بڑی بات ہے، ڈانٹ ڈپٹ، مار پیٹ...... کی عادتیں پشتوں سے پڑی چلی آ رہی ہیں، انہیں یکلخت کیسے چھوڑ دیا جائے، خصوصا جبکہ ادھر سے بھی غفلت، کام چوری، بدخواہی، بلکہ خیانت کے بھی تجربے بار بار ہوتے رہیں'' (ایضاً ص ۳۴۵)

تعمیری اور اخلاقی قدروں کی ایک جھلک اس پیراگراف میں بھی موجود ہے جو مولانا کی والدہ ماجدہ کے اوصاف و کمالات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، مولانا لکھتے ہیں:

''مزاج کی نیک، ہمدرد، غریب پرور، اور بڑی فیاض تھیں...... عفت وحیاداری کے جس ماحول میں ساری زندگی گذاری، اس کا اب سمجھ ہی میں آنا مشکل ہے، شرمیلی اتنی تھیں کہ اپنی ہی سی شریف ومعزز، لیکن اجنبی بیویوں سے ملنے میں جھجکتیں ان سے باقاعدہ پردہ کرتیں...... شوقِ عبادت میں اپنی نظیر آپ تھیں، عمر طویل پائی ...... صلۂ رحم میں عزیزوں، قریبوں، ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک میں اپنی مثال آپ تھیں، بڑی خوددار اور غیرت مند تھیں، لیکن خودی سے نا آشنا'' (ایضاً ص ۴۵، ۴۴، ۴۳)

آپ بیتی کی چند اہم خصوصیات:

اس آپ بیتی کے مطالعہ سے چند خصوصیات اور خوبیاں نظر آئیں جنہیں بے تکلف سپرد قرطاس کر دینے کو جی چاہتا ہے، ذیل میں خصوصیات کی جھلکیاں دیکھتے چلیں:

☆ اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا دریابادی کے قلم نے حیرت انگیز دلچسپی رکھ دی ہے، اسلوب میں سادگی ہے، لیکن پھیکا پن نہیں، تصنع وتکلف اور آورد تو گویا ان کا قلم جانتا ہی نہیں، ہر صفحہ بے ساختگی، برجستگی اور آمد کے لحاظ سے خطۂ گلزار ہے تو دلکشی دلآویزی اور جاذبیت کے لحاظ سے نمونۂ بہار، کوئی لفظ نہ مبتذل نہ رکاکت آمیز، کوئی ترکیب ایسی نہیں جو ذوق لطیف پر بار ہو، عبارت اور فقرے کے کسی گوشے اور الفاظ وتعبیرات کے کسی شوشے سے بھی تعقید واغلاق مترشح نظر نہیں آتا، ہر بندش چست، ہر ترکیب نرالی، البیلی، دل کو چھوتی نظر میں سماتی اور دل ودماغ کو اپیل کرتی ہوئی، سلاست وحلاوت، روانی وچاشنی قلم کے بوند بوند سے ٹپکتی ہوئی، محاورے، مصرعے اور اشعار جابجا ایسے برمحل جڑے ہوئے کہ ذوق ادب وجد میں آجائے اور وجدان جھوم جھوم جائے؛

☆ اس آپ بیتی میں مولانا کے ''قلم خوش رقم'' نے ادب انشاء کا جو جادو جگایا ہے وہ ہر کسی کے لئے سہولت کے ساتھ ارزانی نہیں ہوتی، یہیں سے ایک ''فطری اور غیر فطری ادیب'' کا فرق بھی سمجھ میں آجاتا ہے، الفاظ پر قدرت اتنی کہ روزمرہ کے جملوں میں تقدیم وتاخیر کر کے اس میں حد درجہ چاشنی بھر دیتے ہیں، اشارات و کنایات اور کہیں طنز ومزاح سے کام لے کر عبارت میں جان ڈالدینے کے ہنر سے مولانا کا قلم خوب آشنا ہے، عناوین ایسے البیلے، اچھوتے، نرالے اور مختصر، کہ ہزاروں عناوین کے بیچ میں پہچان لئے جائیں، ''جامعیت واختصار اور ایجاز و اعجاز'' مولانا کی تحریروں کی سب سے بڑی پہچان،

اسلوب بیان کی باریکیوں، لطافتوں، نزاکتوں کے نہ صرف رمز آشنا، بلکہ ان کے محرم راز، منتشر خیالات اور افکار پریشان کو حسنِ ترتیب بخشنا ان کے ماہر فلسفی ہونے کی دلیل- زبان و بیان پر مولانا کی قدرت کا قائل تو مدتوں سے تھا، لیکن ان کی تحریروں کی ''شانِ ندرت'' کی یکتائی بھی اب تسلیم کرتے بنی۔

☆ یہ آپ بیتی ایک بھرپور زندگی کی روداد ہے، مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک فرد ہی نہیں، ایک پورے عہد کی زندگی کے نشیب و فراز ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

☆ اس آپ بیتی کے مطالعہ کی جہتیں بھی متنوع ہوسکتی ہیں، اس میں سفرنامے کا خوب صورت انداز ملتا ہے تو شخصی خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے بھی، عملی زندگی کے ساتھ ساتھ ذہنی زندگی کی روداد سفر بھی ملتی ہے، پرانی تہذیب کی مرقع نگاری بھی ہے اور تہذیب نو پر تبصرے اور تنقید بھی، اور یہ سب کچھ طلاقت لسانی اور قلم کی روانی کے ساتھ۔

☆ اس آپ بیتی سے اندازہ ہوا کہ مولانا دریابادی کو ابتداہی سے کتب بینی، اور مطالعہ کا شوق نہیں حرص تھی بلکہ مولانا ہی کے الفاظ میں اس سے ''نسبت تعبدی'' قائم تھی، ''کتابوں کی درسگاہ'' ان کا سب سے بڑا راحت کدہ تھی، کوئی سی بھی کتاب ہو، کسی بھی موضوع پر اور کسی بھی زبان میں، بس ان کے علم میں آنے کی دیر، کتاب کیا ملی کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، اب نہ مطلب کھانے پینے سے، نہ پرواہ آرام و راحت اور جسمانی زیاں وضرور کی، گویا وہ عاشق اور کتاب معشوق!

☆ اس آپ بیتی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولانا دریابادی کو ''غرور علم'' کا نشہ کبھی سوار نہیں ہوا، ورنہ پندار علم تو پندار مال سے خطرناک ثابت ہوتا رہا ہے، اور مولانا تو تقریباً علوم وفنون کی اکثر شاخوں پر- بقدر ضرورت ہی سہی- اپنی معلومات رکھتے تھے، ماحول اور فضا بھی مکمل سازگار تھی کہ خود کو بڑا سمجھتے اور دوسروں کو سمجھاتے، لیکن مولانا نے سچے متلاشیان علم کی طرح اپنے آپ کو پوری زندگی طالب علم ہی بنائے رکھا، اس کی جھلک آپ بیتی کی مختلف جگہوں میں موجود ہے۔

☆ اس آپ بیتی کا نقص نہیں اس کی خوبی ہے کہ مولانا نے بڑی بے باکی کے ساتھ اندرونی چیزوں- جن کو عام طور پر مخفی رکھا جاتا ہے- کو بھی کھول کھول کر بیان کیا ہے اور نجی زندگی کے بعض گوشوں سے پردے اٹھائے ہیں، بہت ممکن ہے اس میں ان کے ماہر طبیعات ونفسیات ہونے کا اثر اور دخل ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک امانت دار اور سچے مصنف کا یہ فرض ہے کہ ایسی باتوں کو بھی سامنے لائے، تاکہ اس باب میں بھی رہنمائی مل سکے، لیکن متین و شائستہ اسلوب میں- جس میں مولانا دریابادی کی کوئی مثال نہیں۔

☆ اس آپ بیتی کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مولانا نے اپنے قلم کا زور صرف ''بیان'' پر صرف کیا ہے ''آرائش بیان'' پر نہیں، گویا ان کا عقیدہ اور ایمان ہے کہ ؎

منظور ہے گذارشِ احوال واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

اس طرح یہ آپ بیتی دلچسپ بھی ہوگئی ہے، دلآویز بھی، خوش گوار بھی ہوگئی ہے اور شوق انگیز بھی، اور ادبی اور تعمیری حیثیت سے بلند بھی، مختصر بھی ہے جامع بھی، حکمت آموز بھی ہے عبرت آمیز بھی اور سب سے بڑھ کر اسلامی حمیت، ملی غیرت اور باطنی نسبت کے حامل قلم کار کی قابل رشک زندگی کا مرقع بھی۔

دیکھئے میری آپ بیتی میں کبھی صورت اپنی
یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے۔

☆☆☆

تجزیہ

میدان عمل میں قدم اٹھانے کی ضرورت
اور مسلمانوں کا حال

ابوطلحہ ندوی مظاہری

اللہ کے رسول ﷺ کی آمد اور آپ ﷺ سے قبل آنے والے تمام انبیاء سابقین کی تشریف آوری اس لئے تو قطعی نہیں ہوئی تھی کہ انبیاء کی فہرست میں اضافہ کیا جائے یا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو وقتاً فوقتاً اپنی خدائی کی تجدید کے لئے کچھ افراد کی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ کی ذات نہ کبھی کسی کی محتاج تھی اور نہ کسی کے اندر اس کی صلاحیت ہے کہ وہ خدا کی خدائی کی تجدید میں معاون بن سکے، اللہ رب العزت کا ہر کام حکمت سے معمور اور منظم ہوا کرتا ہے اور ہر کام اپنے اندر عظیم پیغام رکھتا ہے، دنیا گواہ ہے کہ جب بھی کوئی کام منظم طریقہ پر سلیقہ کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے تو یہی نہیں کہ وہ برگ وبار لاتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی سیراب کرتا ہے، تمام انفاس قدسیہ کا دنیا میں تشریف لانے اور ایک پیغام کو مختلف زاویوں اور مختلف طریقوں سے دنیا والوں کے سامنے رکھنے کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا خدا کے پیدا کئے گئے بندوں کو خدا سے جوڑنا اور ان کو باور کرانا کہ جو اصل ہے، جہاں سب کو لوٹ کر جانا ہے اور جو افزائش کا مقصود ہے اس کو پہچانو، اس حقیقت کو سمجھ کر اپنے نفع اور نقصان کا صحیح اندازہ کرو اور ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرو کہ خدا کے روبرو ہونے پر سرشرم، افسوس اور پچھتاوے سے جھکا ہوا نہ ہو، یہ احسان ہے اللہ رب العزت کا کہ انبیائے کرام کے ذریعہ اس نے ہم سب کو اپنی آخرت کے سنوارنے کا موقع عنایت فرمایا، اور آخرت کا سنوارنا محض ذاتی عبادتوں اور ریاضتوں سے حاصل نہیں ہوسکتا، جہاں ایک طرف عبادت کی اپنی ایک اہمیت ہے وہیں اس بات سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم کو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اس راستہ پر چلانے کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے جس سے دوسروں کا بھی مستقبل سنور سکے اور یہی وہ حکیمانہ طریقہ کار ہے جس کے لئے بطور نمونہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے سابقین اور دیگر مصلحین امت کو دنیا میں بھیجا تاکہ تمام مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنی طاقت اور وسعت کے بقدر اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش کریں، صرف تمنائیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، محض زبانی جملہ بازی کبھی نتیجہ نہیں دے سکتی، اس کے لئے ایک منظم سوچ، مضبوط ارادہ، جہد مسلسل اور صحیح اسلامی طریقہ کار کو اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، شاخ نازک پر بنایا گیا آشیانہ کبھی بھی پائیدار نہیں رہتا، آشیانہ مضبوط ہو اس کے لئے اس کی بنیاد بہت ماہرانہ انداز میں اور صحیح تقاضوں اور ضابطوں کے حساب سے ہی ڈالنی ہوگی، وعظ وتقریر، تحریر وتدریس بلاشبہ کارگر ثابت ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ عملی میدان میں خود اتر کر انتھک محنت کی بھی شدید ضرورت ہے، اور یہ جذبہ تبھی ہم لوگوں میں پیدا ہوسکتا ہے جب ہم انبیاء کی

بعثت اوران کی تعلیم کو مدنظر رکھیں گے۔

آج حالات ہمارے خود خراب کئے ہوئے ہیں، دوسروں پر الزام تھما کر خود بری الذمہ ہوجانا حالات کو درست نہیں کرسکتا اور نہ ہی ہم اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی سے بچ سکتے ہیں، ہم کو ہمیشہ اس بات کا شکوہ رہتا ہے کہ کوئی تو قوم کی حالات کی تبدیلی کے لئے غور کرے، کوئی تو قدم اٹھائے، آگے بڑھے، لیکن ہم خود کیا کر رہے ہیں اور زبانی جمع خرچی کے علاوہ ہم نے امت کے لئے کیا کردار ادا کیا اور اگر کیا بھی ہے تو کس مقصد کے تحت اور کس حد تک؟ جب ہم خود اپنے گریباں میں جھانک کر پوری ایمانداری سے دیکھیں گے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہم نے دوسروں کے لئے تو دور خود اپنے لئے بھی عمل خلوص نیت کے ساتھ محض اللہ کی رضا کے لئے نہیں کیا، الا ماشاء اللہ، خود کو شامل کرتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں ہوگا کہ ہم اور ہماری زندگی کسی طرح بھی صحیح اسلامی طریقوں اور مطلوبہ اسلامی تقاضوں کے مطابق نہیں گزر رہی ہے، وہی مخصوص شب وروز اوران کا گزرنا، وہی مخصوص مشغلے اوران کے لئے سرکھپانا، جیسے ہم کسی خاص مقصد کے لئے دنیا میں بھیجے ہی نہیں گئے ہیں، سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ہماری زندگی اور غیر مسلموں کی زندگی میں کسی بھی طرح کا فرق نہیں ہے، ہم پر ایمان کا لیبل لگا ہے جس سے وہ کافر محروم ہیں مگر ہماری طرز زندگی اور ہمارے حرکات وسکنات بالکل خدا فراموش اور بے حس اور اسلام سے محروم لوگوں کے مشابہ ہیں، ہم صرف یا تو اپنے بال بچوں کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں یا بہت جذبہ بیدار ہوا تو اپنے سے منسلک ادارہ یا محلّہ میں کچھ وقت کا احسان کردیتے ہیں، جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو ہماری ضرورت ہے جو روحانی طور پر اس چیز کے پیاسے ہیں جس کو ہم اپنے سینوں میں ذخیرہ بنا کر مدفون کر چکے ہیں۔

اللہ رب العزت نے ہمیں ایمان جیسی بے مثل و بے مثال دولت عظمیٰ کی عظیم نعمت عنایت فرمائی ہے، خاص طور پر ایمانی حمیت کا دم بھرنے والے اور دین کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر ڈھونے کا غوغہ مچانے والوں کے لئے سوچنے کا مقام ہے جو زبان حال سے اس بات کا دعوی کرتے ہیں کہ وہ حقیقت میں اسلام کی صحیح فکر رکھتے ہیں، انہیں قوم کی کامیابی یا ناکامی سے مطلب ہے، انہیں یہ محبوب ہے کہ ہر طرف اللہ کے ماننے والوں کی جماعت ہو، ایک صحیح مثالی اور اسلامی معاشرہ وجود میں آئے، کل حشر کے میدان میں جب خدا تعالیٰ کافروں سے ان کے ایمان نہ لانے کے بارے میں سوال کر رہے ہوں گے تو کیا جواب ہوگا، ہم اس بات کو بہت اچھے طریقے سے سمجھ لیں کہ ان کے جرم میں کہیں نہ کہیں ہماری کوتاہی کا بھی بہت دخل ہے، کیا ہم میں سے کوئی اس وقت جواب دینے کی حالت میں ہوگا جب خدائے وحدہ لاشریک لہ ان کافروں کے اس جواب پر کہ ہم تک اسلام کی تعلیم کو نہ تو کسی نے پہنچایا اور نہ ہی صحیح اسلام کی تصویر پیش کی، اللہ ہم سے پوچھے گا کہ ان کافروں تک ہماری وحدانیت کیوں نہیں پہنچائی؟ یاد رکھیں کہ اس وقت ہم سوائے پچھتاوے کے کچھ اور نہ کرسکیں گے، اور جو خدا کے آگے سرخ رو نہ ہوسکا، جس پر اللہ نے اپنے فرشتوں کے سامنے فخر کا اظہار نہ کیا تو اس کے بعد ملنے والی جنت بھی کیا مزہ دے گی، اصل مزہ تو خدا کی محبت کے حصول میں ہے۔

یہ جنت مبارک رہے راہبوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

آج اسلام کا سب سے بڑا نقصان خود ہماری غفلت کے نتیجہ میں ہورہا ہے، لوگ روحانی اعتبار سے اپنے مالک حقیقی کے متلاشی ہیں، اکثریت اپنی تشنگی سے عاجز اور دل برداشتہ ہیں، ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لئے دردر بھٹک رہے ہیں>>>

بقیہ صفحہ نمبر ۹۶ پر

قضیۂ فلسطین

انتفاضة القدس

فہیم الامین

تحریک آزادی فلسطین کا آغاز تو اسی دن سے ہو گیا تھا جس دن برطانوی استعمار نے اسرائیل کی حمایت کرتے ہوئے فلسطین کی تقسیم کا آغاز کیا تھا۔ پھر اسی طرح 1948 میں پندرہ مئی تاریخ کا بدترین دن ثابت ہوا جس نے فلسطینیوں کی اپنی سرزمین پر ایک سرطان ریاست کے وجود کو جنم دیا۔ غاصب اسرائیل کے وجود کے دن سے ہی سرزمین انبیاء علیہم السلام پر بسنے والے فلسطینی غاصب اسرائیل او صہیونیوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننے شروع ہوئے، حتیٰ کہ وہ وقت بھی آن پہنچا جب نہ صرف صہیونیوں نے فلسطینوں کے قتل عام پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کو اپنی ہی سرزمین اور وطن اور گھروں سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ آزادی فلسطین کے لئے کئی جنگیں لڑی گئیں۔ فلسطینی عوام نے بھی اپنے حقوق کے غصب کیے جانے پر خاموشی اختیار نہیں کی۔ انہوں نے جس جدو جہد کا آغاز کیا اسے ''انتفاضہ'' کہا جاتا ہے۔ ''انتفاضہ'' یعنی عوامی تحریک۔ فلسطین کی آزادی کی تحریکوں میں انتفاضہ فلسطین کی تحریک انتہائی مقبول اور کارگر ثابت ہوئی۔

انتفاضہ اول

تحریک آزادیٔ فلسطین کی تاریخ میں پہلی تحریک انتفاضہ ۱۹۸۷ء میں شروع اور ۱۹۹۳ء میں اختتام پذیر ہوئی، یہ فلسطینی عوام کی ایک ایسی انقلابی تحریک تھی۔ جو تاریخ میں غاصب صہیونی ریاست اسرائیل کی نابودی کے ایک پیش خیمے کے طور پر یاد کی جائے گی۔

اس تحریک کا آغاز جبالیہ کے ایک مہاجر کیمپ سے ہوا اور پھر یہ تحریک دیکھتے ہی دیکھتے غزہ، مغربی کنارے اور مشرقی قدس سمیت پورے فلسطین میں پھیل گئی۔ انتفاضہ فلسطین کے آغاز میں فلسطینیوں نے پرامن احتجاج، سول نافرمانی اور غاصب اسرائیل سے براءت کے اظہار کے ساتھ کیا۔ فلسطینی عوام کے انتفاضہ میں یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ فلسطینی عوام اتحاد کے ساتھ ایک مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور آپس میں متحد تھے۔

پہلی تحریک انتفاضہ میں فلسطینیوں نے ہڑتالوں اور پر امن احتجاجوں کے ذریعے اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا۔ فلسطینی عوام نے عہد کر لیا کہ وہ غاصب اسرائیل کو ٹیکس ادا نہیں کریں گے۔ تحریک آزادیٔ فلسطین کے پہلے انتفاضہ کو کچلنے کے لیے غاصب اسرائیل نے فوج اور اسلحے سمیت بھاری گولہ بارود کا سہارا لیا لیکن فلسطینیوں نے اس کے جواب میں ''پتھر'' سے مزاحمت کی۔ فلسطینیوں نے انتفاضہ کے دوران جو سب سے زیادہ ہتھیار کا استعمال کیا وہ صرف ''پتھر'' تھا۔ یقیناً آپ نے بھی ایسی تصاویر دیکھی ہوں گی جن میں فلسطینی بچے، جوان اور خواتین اسرائیلی ٹینکوں کے سامنے تنِ تنہا کھڑے ہیں اور پتھروں کی مدد سے اپنا دفاع کر رہے ہیں۔

تحریک آزادیٔ فلسطین کے پہلے انتفاضہ کے دوران غاصب اسرائیل نے ۱۵۰۰ کے قریب فلسطینیوں کا قتل عام کیا جب کہ جواب میں فلسطینیوں نے ۲۰۰ سے زائد اسرائیلی فوجیوں پر حملے کیے اور ان کو جہنم رسید کیا۔ غاصب صہیونی ریاست اسرائیل نے انتفاضہ کے ۶ سال کے دوران ایک لاکھ پچاس ہزار سے زائد فلسطینیوں کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ اس سے قبل ۱۹۸۲ میں غاصب اسرائیل نے اپنے حواری اور غدار امت حافظ الاسد (ملک شام کے موجودہ ڈکٹیٹر وظالم بشار الاسد کا باپ) کے ساتھ مل کر لبنان پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور وہاں پر موجود فلسطینی مہاجرین پر صبرا اور شتیلا کے مقامات پر انسانیت سوز مظالم کی انتہا کی تھی اور اسی طرح فلسطینیوں کو تنظیم پی ایل او کی اعلیٰ قیادت کو فلسطین سے

جلاوطن ہوکر تیونس میں پناہ لینی پڑی تھی۔

اسی تحریک کے دوران ۱۹۸۸ کو ۱۹/اپریل کے روز ایک فلسطینی رہنما ابو جہاد کو تیونس میں قتل کیا گیا۔ دوسری جانب انتفاضہ فلسطین نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ وہ غاصب صہیونی اسرائیل کے خلاف مجرمانہ خاموشی ختم کرے اور فلسطینیوں کو ان کے حقوق دیے جائیں۔ فلسطینی انتفاضہ کے نتیجے میں ہی ۱۹۸۸ میں ہی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی بڑی تعداد نے اسرائیل کی زبردست مذمت کی اور اس کے خلاف قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔ بالآخر ۱۹۹۳ میں فلسطینی عوام کا پہلا انتفاضہ اختتام پذیر ہوا۔

انتفاضہ دوم

تحریک آزادی فلسطین کی انتفاضہ ثانیہ ۲۹ ستمبر ۲۰۰۰ میں شروع اور ۲۰۰۵ میں اختتام پذیر ہوئی۔ دوسرے انتفاضہ کا آغاز اس دن سے ہوا جس دن جمعے کو اسرائیلی وزیر اعظم ایریل شیرون نے بیت المقدس کا دورہ کرنے کا اعلان کیا۔ فلسطینیوں نے مسجد اقصیٰ میں پہنچ کر زبردست احتجاج کیا اور حتی المقدور کوشش کی کہ صہیونی وزیر اعظم کو مسجد اقصیٰ میں داخلے سے روکا جائے۔ اس جدو جہد میں پولیس اور اسرائیلی فورسز کی فائرنگ سے چار فلسطینی شہید ہوئے۔ فلسطینی عوام کے اس دوسرے انتفاضہ کو ''اقصی انتفاضہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

اسی روز غاصب صہیونی افواج کی فائرنگ سے ۲۰۰ سے زیادہ فسلطینی مسجد اقصی (قبلہ اول بیت المقدس) کے دفاع کے لئے زخمی ہوئے تھے۔ اسی روز ہی ایک اور واقعہ میں ایک پرانے شہر میں تین مزید فلسطینی بھی اسرائیلی فوجیوں کی فائرنگ سے شہید ہوئے۔ اس دن کے خاتمے پر کل ۷ فلسطینی شہید اور ۳۰۰ سے زائد زخمی ہو چکے تھے جب کہ فلسطینیوں کے ساتھ جھڑپوں میں ۷۰ سے زائد اسرائیلی فوجی بھی زخمی ہوئے۔ دوسرے ہی روز غزہ اور مغربی کنارے میں فلسطینی عوام کا سمندر سڑکوں پر نکل آیا اور غاصب اسرائیل کی جارحیت کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا۔ اس احتجاج کو روکنے کے لیے صہیونی فورسز نے فلسطینیوں پر براہ راست فائرنگ کی۔ ان مظاہروں کے آغاز کے پانچویں دن تک ۵۰ سے زائد فلسطینی شہید ہوئے جب کہ دو ہزار سے زائد زخمی ہوئے۔ یہ انتفاضہ کی تحریک چلتی رہی اور بالآخر ۲۰۰۵ میں اختتام پذیر ہوگئی۔

بہرحال آزادی فلسطین کی دوسری تحریک انتفاضہ کا اختتام تقریبا پانچ ہزار فلسطینیوں کی شہادت کے بعد ہوا جب کہ اس انتفاضہ میں اسرائیل کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور ۱۲۰۰ سے زائد اسرائیلی فوجی اس انتفاضہ میں واصل جہنم ہوئے۔

انتفاضہ سوم

انتفاضہ ثالثہ کو ''انتفاضہ القدس'' کا نام دیا گیا ہے انتفاضہ ثالثہ فی الوقت بیت المقدس، غرب اردن اور غزہ میں جاری ہے اور آہستہ آہستہ پورے فلسطین میں پھیل رہا ہے۔ فلسطین کی تاریخ گواہ ہے کہ بہادر قوم ہر طرح کا ظلم سہتی آئی ہے۔ لیکن جب بھی دشمن نے قبلہ اول کی طرف میلی نظر سے دیکھا پوری قوم متحد ہوکر دشمن پر چڑھ دوڑی۔ گزشتہ ماہ عبرانی سال نو کے موقع پر سیکڑوں مسلح صہیونی فوجیوں نے مسجد اقصی پر دھاوا بول دیا مسجد کے اندر توڑ پھوڑ اور کافی حصہ نذر آتش کر دیا اور نمازیوں اور معتکفین کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس کی شیلنگ اور بدبودار پانی چھوڑا گیا۔ مسلسل تین دن تک جاری رہنے والی اس سفاکیت نے فلسطینی عوام میں غصے کی لہر دوڑا دی جس کے بعد مغربی کنارے، شمالی غزہ اور بیت المقدس میں جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ اسی دوران اسرائیلی وزیر اعظم کے ایک حکم نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بنیامین نتین یاہو نے اسرائیلی فورسز کو مزید شتر بے مہار بنانے کے لئے کہا کہ اسرائیلی فورسز پر پتھروں سے حملہ کرنے والے فلسطینیوں کو گرفتار کرنے کے بجائے سیدھا سیدھا انکاؤنٹر کر دیا جائے۔ اسرائیلی فورسز نے اس حکم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیلی آرمی پر حملے کا جھوٹا الزام لگا کر نہتے طلباء اور طالبات کو شہید کرنا شروع کر دیا جن میں ہدیل الشلمون، عبدالحلیم التلاحمہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے شہر خلیل میں حماس نے اجتماع عام کا اعلان کیا جس میں قائدین نے خطاب کرتے ہوئے پوری قوم اور امت مسلمہ سے اسرائیل کے خلاف سربکف ہوجانے کی درخواست کی۔ اس اجتماع نے فلسطینی عوام میں جذبہ جہاد کی نئی روح پھونک دی جو انتفاضہ کی شکل میں تاحال جاری ہے۔

☆☆☆

ذکر رفتگاں

ڈاکٹر محمد علی الہاشمی - ایک تعارف

(پ:۱۹۲۵-ف:۲۰۱۵)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نوٹ: ڈاکٹر ہاشمی کی مشہور کتاب "شخصیة المسلم کما یصوغها الاسلام فی الکتاب والسنة" کا اردو ترجمہ مختلف اہل قلم کے تعاون سے ہمارے دوست مولانا قمر الزماں ندوی "انسان کامل- قرآن وسنت کی روشنی میں" شائع کر رہے ہیں، انہوں نے اس کتاب کے مصنف کا مختصر تعارف لکھنے کا حکم دیا، اتفاق دیکھیے کہ جس روز ان سے بات ہوئی اسی کے ایک دو دن بعد ۲/ دسمبر کو مصنف اس دنیا سے رخصت ہوگئے، یہ مختصر سا تعارفی نوٹ اس کتاب میں شامل کرنے کے لئے لکھا گیا جو موقع کی مناسبت سے اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

جمعرات کے روز میں کسی سفر میں تھا، موبائل پر ای میل باکس میں دیکھا کہ رابطہ ادب اسلامی کے صدر دفتر ریاض کا ای میل ہے، کھولنے پر دیکھا کہ ڈاکٹر محمد علی الہاشمی کی رحلت کی اطلاع اور تعزیت ہے، اللہ انہیں غریق رحمت کرے اور اپنی شایان شان عفو ودرگذر کا معاملہ فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے مرحوم ایک ادیب، ایک مفکر، ایک استاد ہونے کے ساتھ قافلہ ادب اسلامی کے رکن رکین تھے، میں ابھی کوئی ایک سال پہلے ہی ان کی تحریروں سے واقف ہوا تھا، میرے دوست قمر الزماں صاحب نے ان کی مشہور کتاب شخصیة المسلم کما یصوغها الإسلام فی الکتاب والسنة کے کچھ صفحات کے ترجمہ کا حکم دیا جس کو وہ اپنی کتاب "تربیت اولاد" میں شامل کرنا چاہتے تھے، یہ پہلا موقع تھا جب ان کی تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا، اب ان کی یہ مشہور کتاب مختلف اہل قلم کے تعاون سے اردو کے قالب میں منظر عام پر آنے کو تیار ہے۔

ڈاکٹر محمد علی الہاشمی سرزمین شام کے مردم خیز خطہ حلب کے باشندے تھے، ۱۹۲۵ میں ان کی ولادت ہوئی، ان کا خاندان ایک متدین گھرانے کے طور پر جانا جاتا، ان کا شجرہ نسب آل بیت سے ملتا ہے، یہ شجرہ ان کے مطابق مکتوب ومحفوظ ہے، بدھ کے روز ۲۰ صفر ۱۴۳۷ مطابق ۲/دسمبر ۲۰۱۵ کو وہ اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔

گھر کے دینی ماحول کے باعث ابتدا سے ہی ان کو دین و ایمان کی حلاوت سے آشنائی رہی، گویا بچپن سے ہی دین اسلام کی محبت اور دعوت اسلامی کی ضرورت واہمیت ان کے قلب و دماغ میں بٹھائی گئی، پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہوتی ہے اس کا اثر نظر آنا ضروری ہے، چنانچہ ان کی تحریروں کا اسلامی رنگ اور اخلاق کریمانہ اسی تربیت اور ماحول کے مظہر ہیں، ان کی وفات پر لوگوں نے ان کی علمی شان کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق کریمانہ کی تعریف کی، انہیں سکون وصبر وشرافت میں بے مثال قرار دیا، ان کے بعض افکار سے اختلاف کرنے والا تو کر سکتا ہے لیکن ان کے ایمان، تواضع، اخلاص اور اپنے افکار پر

اعتماد کے سبب یقیناً ان کی محبت دل میں گھر کر جاتی ہے، یہ سب نتیجہ ہے دعوت اسلامی کے اس ماحول کا جسمیں انہوں نے پرورش پائی، رابطہ ادب اسلامی کے اکثر ممبران اور منسلک بیشتر ادباء وہی ہیں جو فکری طور پر تحریک اخوان سے وابستہ رہے، چنانچہ رابطہ کے وجود میں آنے سے قبل ادب اسلامی کی نمائندہ تحریریں محضر وجود میں آرہی تھیں، ڈاکٹر ہاشمی کا زمان اخوانی تحریک کے دعوتی عروج کا زمانہ ہے، پھر سعودیہ وہ جس زمانہ میں آئے اس وقت سعودیہ اخوانی علماء وادباء کا سب سے بڑا مرکز تھا، سیاسی داؤ پیچ کے سبب اس زمانہ میں سعودیہ اخوان کی پناہ گاہ تھا، بہرحال اس دعوتی ماحول کے باعث ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں دینی غیرت، قرآن وسنت سے محبت اور فکر اسلامی کی ترویج واشاعت کا جذبہ رچ بس گیا، انہوں نے تدریسی میدان میں قدم رکھا تو قرآنی اخلاق کی نمائندگی کی، اپنے طلبہ و رفقاء کے لئے بحث وتحقیق میں مثال بن گئے، ان کو عربیت و اسلامیت کا سبق پڑھایا، قلمی میدان میں آئے تو اس فکر اسلامی کی نمائندگی کی جس نے ان کی تحریروں میں اثر انگیزی پیدا کی اور ان کو ایک مقبول قلمکار کی حیثیت سے متعارف کرایا، انہوں نے دعوت اسلامی کے ماحول میں تربیت پانے کے سبب اپنی کتابوں میں اسلام کے اس تصور شامل وکامل کو پیش کیا جو انسان، انسانی زندگی اور کائنات کو اپنی آغوش میں لیتا ہے، اور ہر ایک کے لئے اصول وضوابط متعین کرتا ہے اور میدان عمل کی صحیح اور تعیین معتدکرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی الہاشمی نے اپنی ثانویہ کی تعلیم حلب میں مکمل کی۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۹۵۲ میں وہ امتحان دیا جس کے نتیجہ میں انہیں حلب میں استاد مقرر کر دیا گیا، ۱۹۵۴ تک وہ اس میں مشغول رہے، پھر انہوں نے ایک اورٹسٹ کوالیفائی کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ اسکالرشپ کے ساتھ دمشق آگئے اور دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الاداب (Faculty of Arts) میں داخل ہوگئے، وہاں ۱۹۵۴ سے ۱۹۵۹ تک قیام رہا، وہاں سے انہوں نے اس دوران نہ صرف عربی زبان اور اس کے متعلقہ علوم میں ڈگری حاصل کی بلکہ اصول تدریس وترتیب (B.ed) وغیرہ کی سندیں بھی حاصل کیں، ۱۹۶۰ میں انہوں نے دمشق یونیورسٹی چھوڑی، اسی سال حلب کے ''ثانویہ البحتری'' میں تقرری ہوگئی، ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۲ تک وہ ثانویہ کی تدریس میں مشغول رہے، ثانویہ البحتری سے اعدادیہ سیف الدولہ پھر ضاعیہ اور کوا کبی میں ٹرانسفر ہوا۔

۱۹۶۲ مطابق ۱۹۸۲ میں انہوں نے سعودی عربیہ کا سفر کیا، وہاں انہوں نے تین سال کلیۃ الشریعہ اور اور شعبۂ عربی دونوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، سعودیہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے انہوں نے جامعہ قاہرہ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی، خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے ایم اے کا مقالہ مشہور ادیب و ناقد اور مؤرخ ادب ڈاکٹر شوقی ضیف کی رہنمائی میں لکھا، ۱۹۷۰ میں انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کی پی ایچ ڈی کے مشرف بھی ڈاکٹر شوقی ضیف تھے، انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ابو یزید محمد بن ابی الخطاب القرشی کی مشہور ومعروف تصنیف جمهرة اشعار العرب فی الجاهلية والاسلام کی تحقیق پر تفویض کی گئی، یہ کتاب عربی شاعری کا ایک ایسا مدلل ومفصل دیوان ہے جس میں جاہلی و اسلامی دور کے منتخب قصائد اور اچھوتے نمونوں کے ساتھ ساتھ اس دور کی سیاسی شاعری کے نمونے بھی ملتے ہیں، اس طرح حکمت ونصیحت سے عبارت اشعار بھی اس کتاب کی زینت ہیں، اس کے علاوہ اس کتاب میں موجود متعدد موضوعات کے باعث عربوں کی نفسیات اور ان کی معاشرتی روایات واقدار کے متعلق مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ کتاب عربوں کی قبائلی اور اجتماعی زندگی کے حالات، ان کی جنگیں اور ان کے عادات واطوار کا مستند رکارڈ ہے، عربی شاعری کے بارے میں کہا ہی گیا ہے، الشعر ديوان العرب، ڈاکٹر ہاشمی نے اس نادر وو قیع

کتاب کی تحقیق کے لئے اس کے متعدد نسخوں کا تقابل کیا، ویٹیکن استنبول، حیدرآباد اور علی گڑھ کے ساتھ برٹش میوزیم پرسٹن یونیورسٹی کی لائبریری اور پیرس کی نیشنل لائبریری کے ساتھ حرم مکی اور علامہ حمد الحاسر کے نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کتاب کی تحقیق کی

ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۲ سال تک حلب یونیورسٹی کے کلیۃ الادب میں تدریسی خدمات انجام دیں، بعدازاں سعودیہ کی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کی دعوت پر ۱۳۹۴ مطابق ۱۹۷۴ء اس کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ سے منسلک ہو گئے، اور ۱۴۰۸ مطابق ۱۹۸۸ تک وہیں تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے، ۱۹۸۸ میں تعلیمی سال کے آغاز پر کلیۃ الاداب کے شعبہ نسواں میں تدریس کے لیے منتقل ہوگئے، پھر ۱۴۱۶ مطابق ۱۹۹۶ میں یہیں سے ریٹائر ہوئے، قانونی طور پر تو تعلیمی وتدریسی سلسلہ منقطع ہوگیا مگر تاحیات علمی مشغولیات جاری رہیں، بحث وتحقیق کا سلسلہ چلتا رہا، اور اہل علم ان کے فیضان قلم سے مستفید ہوتے رہے، ڈاکٹر ہاشمی علمی وادبی کانفرنسز میں بھی شریک ہوئے سعودیہ اور دیگر اسلامی ممالک کی متعدد کانفرنسز کو انہوں نے زینت بخشی، ایم اے اور ایچ ڈی کے مقالات بھی ان کے اشراف میں لکھے گئے۔ ۱۹۷۷ میں ان کی کتاب شخصية الرسول ودعوته فی القرآن الکریم منظر عام پر آئی یہ کتاب سیرت رسول پر اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے۔

ڈاکٹر ہاشمی کی کتابیں شخصية المسلم كما يصوغها الاسلام فی الكتاب والسنة اور شخصية المرأة المسلمه كما يصوغها الإسلام فی الكتاب والسنة اور المجتمع الاسلامی كما يبنيه الإسلام فی الكتاب والسنة کے ہزاروں نسخے شائع ہوئے، ان کی یہ کتابیں شخصية المسلم وشخصية المسلمة انگریزی، فرنچ، رشین، زبانوں کے علاوہ ہنگری، ترکی، ملائی، کردی اور اردو میں منتقل کی گئی، ان کی کتاب شخصية المرأة المسلمة کے اکثر موضوعات خود مؤلف کی آواز میں سعودی عرب کے ریڈیو اذاعة القرآن الكريم سے نشر کیے گئے، شیخ امین سراج کے مطابق ترکی میں ہر دیندار گھرانے کی متدین خاتون اپنی مجلسوں میں اس کتاب کو ضرور پڑھتی ہے، بعض ترک نوجوانوں کے مطابق اس کتاب نے ترکی میں عورتوں کی اسلامی نشأۃ ثانیہ میں بڑا کردار ادا کیا ہے، ان کی یہ کتابیں دار البشائر سے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی ہیں، درحقیقت ان کتابوں کو یہ مقبولیت اس لئے حاصل ہوئی کیوں کہ مصنف نے ان کتب کی تالیف اس جذبہ سے کی ہے جس کا اظہار انہوں نے خود کیا ہے کہ اسلام محض نظریاتی دین نہیں ہے جس کے چٹخارے لئے جائیں، اور اس پر صرف نظریاتی بحثیں کی جائیں، اللہ نے قرآن کو صرف اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ لوگ اس کو محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے پڑھیں اور برکت حاصل کریں، نہ وہ اس کے معانی ومطالب سمجھیں اور نہ اس کے مقاصد ومطالبات سے واقف ہوں، اس دین کو اللہ نے اس لئے نازل کیا ہے کہ وہ فرد کی زندگی پر حکمرانی کرے، اجتماعی زندگی اس کے تابع ہو، اس کی روشنی میں انسانیت اپنا سفر حیات طے کرے، حضور ﷺ نے دعوت اسلامی کے ابتدائی عہد میں یہی کام انجام دیا، کہ آپ نے ایسے افراد تیار کیے جن کے رگ وپے میں اسلام سرایت کر گیا جو اس دین کے داعی وفدائی اور شیدائی بن گئے، پھر وہ قرآنی انسان بن کر دنیا کے چپہ چپہ پر پھیل گئے، دنیا نے ان قدسی صفت لوگوں میں زندگی کے ایک انوکھے نمونہ کا مشاہدہ کیا، یہ وہ جذبہ ونظریہ تھا جس سے معمور ہوکر اس اسلامی ادیب نے عنان قلم کو مسلمان مرد وعورت اور اسلامی معاشرے کی تعمیر وتشکیل کے لئے قرآن وسنت کے وضع کردہ خطوط پیش کرنے کا پابند کیا۔

سیرت وقرآن کے اس مطالعہ کا فائدہ یہ ہوا کہ اس مفید وبے

مثال کتاب کے بعد ۱۹۸۱ میں ان کی مشہور کتاب شخصیۃ المسلم کما یصوغھا الإسلام فی الکتاب والسنۃ شائع ہوئی، قارئین کے یہاں قبول عام نے اس کتاب کو پبلشرز کے یہاں بھی مقبول بنادیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک سال میں کئی کئی ایڈیشن نکلنے لگے، انگریزی و ترکی میں اس کا ترجمہ ہوا، ترکی میں اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ایک ایک سال میں یہ دو دو تین تین مرتبہ شائع ہوئی۔

نقد وادب اور بلاغت وعروض پر بھی ان کی تصنیفات ہیں، خود جمھرۃ اشعار العرب کی لاجواب تحقیق محققین و باحثین کے لیے مرجع ہے، ان کے ایم اے کا مقالہ بھی عدی بن زید العبادی الشاعر المبتکر حیاتہ وشعرہ شائع ہو چکا ہے، ان کی ایک کتاب المنھل العذب فی الدراسۃ الادبیۃ والإعراب والبلاغۃ والعروض والقوافی ہے، اس سلسلہ کی دوسری کتاب العروض الواضح وعلم القافیۃ ہے، ڈاکٹر ہاشمی نے زمانہ جاہلیت کے ایک شاعر کو جو اصحاب معلقات میں ہے اپنی بحث وتحقیق کا موضوع بنایا اور اس طرح ان کی کتاب طرفہ بن العبد حیاتہ وشعرہ شائع ہوئی، عہد اسلامی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے ایک شاندار کتاب کعب بن مالك الانصاری الصحابی الشاعر الادیب تصنیف کی۔ اس کتاب کی تصنیف کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں جب اس کی تصنیف وتحقیق میں مشغول تھا تو فرحت وانبساط کی عجیب کیفیت تھی، اس کام میں عجیب سکون ونشاط حاصل تھا، وجہ شاید یہ تھی کہ صحابی رسول کعب بن مالک پر لکھتے ہوئے میں اس مبارک عہد کی سیر کرتے لگتا تھا جس عہد میں نبوت کی شمع فروزاں تھی، جس عہد میں دنیا تلاوت قرآن سے مخطوط ہو رہی تھی، انسانی وجود میں سب سے بہتر انسانوں کی وہ جماعت ہے جنہیں صحابی رسول ہونے کا شرف حاصل ہے، جنہوں نے عہد نبوت کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے اور آغوش نبوت کے انوار سے منور ہوئے ہیں، جنہوں نے نبی کریم سے غلبۂ اسلام کے لئے بیعت کی تھی، حضرت کعب بن مالک بھی اس مبارک جماعت کے ایک فرد تھے، انہوں نے عہد جدید کی شخصیت کو بھی موضوع بنایا اور مشہور اسلامی شاعر عمر بہاء الدین امیری پر اپنی بیش قیمت تصنیف شائع کی، ان کی شاعری اور ان کے فن کو پڑھنے کے لئے ان کے متعدد واوین میں سے ان کے دو دیوان "اب" اور "امی" پر خاص توجہ مرکوز کی۔ اس طرح ۱۹۸۶ میں ان کی کتاب عمر بھاء الدین الدمیری شاعر الأبوۃ الحانیۃ والبنوۃ البارۃ والفن الاصیل منظر عام پر آئی۔

ان کے ادبی اور اسلامی موضوعات پر لکھے گئے مقالات و بحوث اور ریڈیو پر نشر کی گئی تقاریر کا مجموعہ ومضات الخاطر بحوث ودراسات اسلامیۃ، اجتماعیۃ، ادبیہ کے نام سے شائع ہوا، اس کے علاوہ ان کی بعض دیگر کتابیں مفاخر القضاء الاسلامی کما یجلیھا الاسلام فی الکتاب والسنۃ اور سلبیات أن تختفی من الاسلامیین اور الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ کما عرفتہ وغیرہ ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ ڈاکٹر محمد علی ہاشمی ان ادباء واہل قلم میں تھے جنہوں نے اپنی زندگی سے کام لیا، ذہنوں کی تعمیر کی، فکروں کو روحانی غذا فراہم کی، اسلام کی عصری اسلوب میں ترجمانی کی، اپنے قلم سے اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام لیا، نظریاتی بحثوں سے بالا ہو کر قرآن وسنت سے متفق علیہ اصول مستنبط کیے اور فرد ومعاشرے کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل نو کی تگ ودو میں حیات مستعار کا بڑا حصہ صرف کیا، انہوں نے دعوت اسلامی کے ماحول میں تربیت پائی، اسی کی ترویج وترقی کو اپنا نصب العین بنایا، اسی کے ارکان اور داعیوں کی صف میں دین وامت محمد کے خادم کی حیثیت سے شامل رہے، یقیناً عنداللہ وہ اپنے اس نیک عمل کا بہترین بدلہ حاصل کر رہے ہوں گے۔

☆☆☆

ذکر رفتگاں

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

پروفیسر سلمان بیگ بھی رخصت ہو گئے

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

۱۵؍دسمبر ۲۰۱۵ء کو دوپہر کے وقت پروفیسر سلمان بیگ صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے، متعلقین ومتوسلین اور احباب واقرباء کے جم غفیر نے نمناک آنکھوں کے ساتھ بعد عشاء ۹؍بجے مسلم یونیورسٹی کے منٹوئی قبرستان میں ہمیشہ کے لئے الوداع کہا، بڑی جلدی جلدی علی گڑھ کی سرزمین اللہ کے نیک بندوں سے خالی ہورہی ہے، پہلے مولانا عثمان صاحب رخصت ہوئے پھر ڈاکٹر غیاث صاحب داغ مفارقت دے گئے اوراب ڈاکٹر سلمان بیگ صاحب نے بھی خیر باد کہا، اس قلیل عرصہ میں یہاں سے ان تین شخصیات کا اٹھ جانا یقیناً ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مرحوم سلمان بیگ صاحب کا تعلق ایک متدین گھرانے سے تھا، ان کا اصل وطن بہرائچ تھا، ۱۹۵۵ء میں وہ علی گڑھ آئے، ان کی تعلیم دلی کے ذاکر حسین کالج میں ہوئی پھر علی گڑھ منتقل ہوئے، ۱۹۶۲ء میں وہ مسلم یونیورسٹی کے انجینرنگ کالج میں لکچرر مقرر ہوئے پھر ریڈر وپروفیسر ہوئے، پرنسپل بھی رہے اورای سی کے ممبر بھی ہوئے، وہ یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور مختلف ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتے تھے۔

علی گڑھ میں دعوت وتبلیغ کا مرکز ان کی تگ ودو سے عبارت ہے، سرسید نگر کی وسیع وعریض سادہ مگر پرشکوہ ''مسجد انوار'' کی تعمیر میں ان کا بنیادی کردار ہے، یہ مسجد اس وقت بندگان خدا کی اصلاح اور دعوت وتبلیغ کا مرکز ہے، مرحوم نے اسی مسجد میں پہلے پہل مدرسہ اساس العلوم قائم کیا تھا، جہاں سے متعدد حفاظ نکلے اور بڑی تعداد نے وہاں قرآن پڑھنا سیکھا اور دینیات کی بنیادی تعلیم حاصل کی، ۲۰۰۲ء میں وہ انجینئرنگ کالج سے ریٹائر ہوگئے تھے، اس کے بعد بچیوں کے لئے مدرسہ اسلام الحق للبنات قائم کیا تھا۔ آخری عمر میں بھی معاشرے کو اللہ سے جوڑنے کی فکر میں لگے رہے، علی گڑھ میں ان کا شمار دعوت وتبلیغ کے بنیادی ارکان میں ہوتا ہے، یونیورسٹی میں مذہب بیزاری کا جو ماحول پیدا ہوا تھا اس کی سنگینی کے قصے سن کر ڈر لگتا ہے، اس ماحول میں ان جیسے حضرات نے بڑی جدوجہد کی اور اس ماحول کو کسی قدر بدلنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

پروفیسر سلمان بیگ صاحب حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں تھے، حضرت شیخ کی تربیت میں رہے تھے، ایک عرصہ تک ان کی خدمت کی، ان کی ہدایات پر تا عمر عمل پیرا رہے، ابتدا میں تو مسلم یونیورسٹی میں ان کی زندگی عام زندگی تھی، لیکن پھر ایک تبدیلی آئی اور حضرت شیخ کے یہاں حاضری شروع ہوئی، پھر وہ تعلق قائم ہوا جو آخر تک باقی رہا اور بقول مولانا شاہد الحسینی صاحب حضرت شیخ انہیں

بہت عزیز رکھتے تھے اوران سے بڑی محبت کرتے تھے، بیعت و ارشاد کا بھی سلسلہ رکھتے تھے، تاہم اس سلسلہ میں زیادہ شہرت نہ تھی لیکن پھر بھی متوسلین واہل تعلق کا ایک حلقہ ہے، یہ بھی ان کے خلوص ووفا اور دینداری کی دلیل ہے کہ اس سلسلہ کو نام ونمود کا ذریعہ نہیں بنایا، روزانہ صبح کو ان کی مجلس ہوتی تھی، چونکہ اس مجلس کی نسبت حضرت شیخ کی طرف تھی اس لئے اس مجلس کی رونق وقار ہی کچھ اور ہوتا تھا، آخری ایک سال میں وہ علالتوں سے دوچار رہے تو مجلس بعد عصر تا مغرب ہونے لگی، مجلس میں لا الہ الا اللہ کا ورد ہوتا، ذکر بالجہر کا معمول تھا، حضرت شیخ کی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھی جاتی، بسا اوقات بعض دوسری کتابیں بھی پڑھی جاتی تھیں، علی گڑھ واطراف میں متوسلین کا خاصا حلقہ ہے، وہ مجاز بیعت وخلافت بھی تھے، حافظ نصیر صاحب، جلیسر کے مولانا محمود صاحب ان کے خلفاء میں ہیں ماسٹر افتخار صاحب فرخ آبادی بھی ان کے خلیفہ ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث سے نسبت کی بنا پر مزاج میں اعتدال تھا، ان کے ایک مرید نے بیان کیا کہ ''میرے شیخ نے میرا نکاح طے کر دیا اور حکم دیا کہ مسجد پہنچو وہیں نکاح ہونا ہے، میں نے عرض کیا حضرت میں جماعت میں ہوں دس دن رہ گئے ہیں، فرمایا کہ چلہ نماز ہے، جو ٹوٹ جائے گا فوراً آؤ یہ کام ہونا ہے'' سچ یہ ہے کہ دینی کاز کے لئے ایسے ہی اعتدال اور وسعت ذہنی کی ضرورت ہے، ایسے متعدد واقعات ہیں مگر انہیں لکھنے کا حق اسی کو ہے جو قریب رہا ہو، دیکھا ہو، ان کو پہچانا ہو، مجھے تو صرف یہ سطریں لکھ کر خراج عقیدت پیش کرنا ہے اور اپنے قارئین کو بتانا ہے کہ دنیا سے ایک اور خادم دین وملت، بندۂ خدا اور عاشق پاک طینت رخصت ہوگیا، ان کے لیے ایصال ثواب کیا جائے اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھا جائے۔

ان کے ایک صاحبزادے سفیان بیگ صاحب بھی انجینئرنگ کالج میں ہیں، آج کل وہی پرنسپل بھی ہیں، ان کی دیانت وسعادت کے بڑے قصے سنے ہیں، قرآن پاک انہوں نے بہت کم وقت میں حفظ کیا، راقم نے سرسید نگر کی مسجد میں ان کی اقتدا میں متعدد نمازیں ادا کی ہیں، حدر میں بہت خوبصورت لحن کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں، پروفیسر بیگ مرحوم کے پسماندگان میں ان کے علاوہ ایک بیٹی ہیں، مرحوم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر فیضان بیگ صاحب شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی میں استاد ہیں، راقم سطور ایم، اے کے دونوں سالوں میں ان کا شاگرد رہا ہے، وہ ایک متدین انسان اور ایک مخلص استاد ہیں۔

پروفیسر بیگ صاحب کی شخصیت مختلف الجہات تھی، دینی اور فلاحی کاموں میں تو شروع سے ہی وہ شریک رہے، ہمیں امید ہے کہ ان پر کوئی صاحب قلم تفصیل سے مضمون لکھے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ مقبول بارگاہ الٰہی تھے، ان کے جنازے میں نمازیوں کا ازدحام اس پر شاہد ہے، جس تعداد میں لوگ شریک غم اور شریک جنازہ تھے اسے دیکھ کر یقیناً مادیت پسند اور مناصب کے طالب دانتوں تلے انگلیاں دبا رہے ہوں گے اور سوچا ضرور ہوگا کہ خادم دین اور مومن کا جنازہ ہے، کس شوکت اس بندۂ خدا کو الوداع کہا جا رہا ہے، ممکن ہے کہ کچھ لوگ اسی سے سبق لے کر اپنی زندگیوں میں تبدیلی لائیں۔ وہ اپنے پیچھے خیر کے بہت سے کام چھوڑ کر گئے جوان کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں، علم نافع کے وسائل، اور ولد صالح کی نعمت بھی ان کو حاصل ہے، ہمیں امید ہے کہ وہ اب اپنے رب کے حضور سرخرو ہو رہے ہوں گے اور رب کریم ان کو اپنی شایان شان نواز رہے ہوں گے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

تعلیمی خبریں

عالمی تنظیم فارغین ندوہ کی طرف سے حفظ اشعار کا انعامی مسابقہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عالمی تنظیم فارغین ندوہ ایک متحرک وفعال تنظیم ہے، اس کے صدر ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی بذات خود اپنی حرکیت وفعالیت میں بے مثل ہیں، اس تنظیم کی جانب سے وقتاً فوقتاً کچھ ایسے پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں جو ندرت وجدت اور افادیت سے خالی نہیں ہوتے، اسی سلسلہ کا یہ پروگرام حفظ اشعار کا انعامی مسابقہ تھا جو مختلف مدارس کے طلبہ کے درمیان منعقد کیا گیا، راقم کو بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔

کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کی شاعری پر اچھی نظر ہو، زبان میں مہارت تب ہی حاصل ہوتی ہے جب اشعار کا معتد بہ ذخیرہ ذہن کے کسی گوشہ میں محفوظ ہو، جہاں تک عربی شاعری کی بات ہے تو اس کے حسن ونزاکت اور اس کی اہمیت کا انکار کسی صاحب علم کے بس کی بات نہیں، اسی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر فیضی صاحب کے والد محترم اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی صاحبان نے ایک منتخب مجموعہ تیار کیا تھا، جس پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا مقدمہ بھی ہے، بنگال کی وزارت تعلیم نے اس کتاب کو اپنے عربی نصاب میں جگہ دی، یہ مجموعہ تمام مجموعات میں سب سے بہتر ہے، یہ کہنا بڑی جرأت کی بات ہے، لیکن یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ ایک بہترین مجموعہ ہے جس میں ہر دور کے خوبصورت نمونوں کو منتخب کیا گیا ہے اور جو انتخاب کرنے والوں کے ادبی ذوق پر دلالت کرتا ہے، محترم فیضی صاحب نے اس کی نئے سرے سے طباعت کا انتظام کر کے اپنی علمی وادبی دلچسپی نیز اپنے والد محترم کے کاموں سے محبت کا ثبوت دیا ہے، اس کو ہمارے فاضل دوست فرمان نیپالی ندوی صاحب نے ایڈٹ کیا ہے، اشعار کی تخریج کی ہے، مبہمات کی توضیح کی ہے، شعراء کے تراجم نقل کیے ہیں، اس طرح یہ کتاب ایک مفید، مکمل اور حسین مجموعۂ اشعار کی صورت میں سامنے آئی ہے، یہی مجموعہ طلبہ کے حفظ اشعار کے لیے متعین کیا گیا تھا۔

رہی بات انعامی مسابقہ کی تو میرا نظریہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہر مدرسہ کی ترتیب اور تعلیمی نظام میں اس طرح کے ثقافتی مقابلے بھی شامل ہونے چاہیے، طلبہ کا ذہن مسابقاتی بنانا چاہیے، مسابقات میں جدت ہونی چاہیے، محض ایک لگے بندھے نظام سے اس دور میں وہ ٹیلنٹ حاصل نہیں ہوسکتا جس کی ضرورت ہے، یہ مسابقہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جو واقعی بہت خوب تھا، طلبہ کی تیاری لاجواب تھی ان کے درمیان فیصلہ کر پانا دشوار تھا، الحمدللہ اس طرح کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں، سال گزشتہ ہم نے خود آل یوپی مسابقوں کا انعقاد کیا تھا، جس میں کئی مقابلے بڑے اچھوتے اور نئے انداز کے تھے، ابھی جودھپور راجستھان کے آل راجستھان اسلامی مسابقوں میں بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوا، ان کی کوششیں بھی بڑی کامیاب تھیں، عصری اسکول کے طلبہ میں دینی شعور اور اسلامی معلومات کے لئے اس طرح کے مقابلہ یقیناً بہت مفید ہیں، پورے راجستھان سے ۲۰۷۵ طلبہ شریک ہوئے تھے، سال گزشتہ ہم نے علی گڑھ کی سطح پر اسی فکر کے تحت اسکولوں کے مابین ''سائنس ودینیات مسابقہ'' کرایا تھا جو واقعی بڑا مفید تھا، ۱۰۰ سوالات میں ۲۰ سوالات دینیات کے تھے پھر بھی تقریباً ساڑھے پانچ سو طلبہ میں ۴۰ غیر مسلم طلبہ شریک ہوئے تھے اور طرفہ یہ کہ بعض نے پوزیشن بھی حاصل کی تھی۔

بہر حال اس طرح کی تعمیری کوششیں لائق ستائش اور قابل مبارکباد

ہیں، جو لوگ نونہالان ملت کی علمی، فکری اور ذہنی تعمیر کے لئے کوشاں ہیں وہ واقعی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، بڑی بڑی باتوں سے بہتر ہے کہ کچھ بچوں کو ہی کسی نہ کسی ناحیہ سے تیار کیا جائے محترم ڈاکٹر فیضی اور وہ تمام حضرات جو اس پروگرام کو منعقد کرنے کے لئے کوشاں تھے وہ قابل رشک اور مبارکباد کے مستحق ہیں، ذیل میں مولانا مناظر منعم رحمانی کی اس پروگرام سے متعلق رپورٹ پیش کی جارہی ہے، جو اس پروگرام کے کنوینر بھی تھے۔

عربی حفظ اشعار کا دوسرا انعامی مسابقہ

(مناظر منعم رحمانی ندوی)

مؤرخہ ۲۶ر نومبر ۲۰۱۵ء بروز جمعرات ''عالمی تنظیم فارغین ندوہ'' کے زیر اہتمام مدرسہ سیدنا بلال ڈالی گنج (ملحقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) میں دوسرا ''انعامی مسابقہ حفظ عربی اشعار'' لکھنؤ واطراف لکھنؤ کے طلبائے مدارس کے درمیان ہوا، اس مسابقہ میں تقریبا ۳۸ر طلباء نے حصہ لیا، پروگرام کے پہلے مرحلے کی صدارت مولانا ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی اور دوسرے مرحلے کی صدارت مولانا محمد عبدالرشید ندوی (مدیر بانگ حراء) نے کی، اس جلسے میں مولانا فخر الحسن ندوی (ناظم مدرسہ سیدنا بلال ڈالی گنج)، مولانا اقبال احمد اعظمی مدنی ندوی، مولانا اعجاز قطب ندوی، مولانا محمد اسامہ، مولانا محمد کوثر ندوی وغیرہ موجود تھے، حکم کے فرائض مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا سرفراز ندوی، مولانا عبد الرشید ندوی راجستھانی نے انجام دئے، مولانا عبدالرشید ندوی (مدیر بانگ حراء لکھنؤ) مولانا مناظر منعم رحمانی ندوی (مہتمم مدرسہ سیدنا بلال) نے پروگرام کو کامیاب بنانے میں زبردست حصہ لیا، واضح رہے کہ یہ پروگرام مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی (صدر عالمی تنظیم فارغین ندوہ مقیم کناڈا) کے تعاون سے منعقد ہوا، وہ ماشاء اللہ ایک جید عالم اور صاحب فضل و کمال ندوی ہیں، سال گذشتہ بھی انہوں نے اس سلسلہ کا پہلا پروگرام کیا تھا، حفظ اشعار کیلئے ان کے والد مرحوم مولانا محبوب الرحمٰن ازہری (سابق استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ ودار العلوم ندوۃ العلماء) اور مشہور محقق مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی (کلکتہ) کی تالیف کردہ کتاب ''المنتخبات العربیۃ'' کو منتخب کیا گیا تھا، اس کا نیا ایڈیشن مولانا محمد فرمان ندوی کی تحقیق سے جلد ہی منظر عام پر آیا ہے۔

جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا محمد فرمان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) نے کہا: قرآن کریم ظاہر کے لحاظ سے معجزہ ہے اور باطن کے لحاظ بھی، قرآن کریم کے ظاہری اعجاز کو سمجھنا اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک اس کے الفاظ، تراکیب، جملوں کی ساخت اور اسالیب کلام پر نظر نہ ہو، اکثر صحابہ کلام ربانی کو سن کر یا پڑھ کر مسلمان ہوئے، عربی زبان وادب میں مہارت کے بغیر یہ صلاحیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

اختتامی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مولانا عبدالرشید ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) نے کہا: عربی اشعار کا یاد کرنا بڑے فخر کی بات ہے، یہ صرف ایک ذوقی اور تفریحی عمل نہیں ہے، بلکہ قرآن فہمی میں بے حد معاون ہے، قدماء میں ایسے افراد تھے، جن کو ایک ایک صنف کلام پر ہزار ہزار اشعار یاد تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے عصر جدید کے مشہور ادیب شیخ عبدالعزیز میمنیؒ سے پوچھا کہ آپ کو کتنے اشعار یاد ہیں، تو انہوں نے بتایا کہ تقریبا ایک لاکھ اشعار یاد ہیں، قرآن کریم نے ایسے شعراء کی مذمت کی ہے جو بامقصد شاعری نہیں کرتے، اور جو شعر کو اسلام کی خدمت اور دین کے دفاع کیلئے استعمال کرتے ہیں وہ اسلام اور قرآن کی نظر میں قابل مدح وستائش ہیں۔

عصر کے بعد مولانا کمال اختر ندوی (عمید کلیۃ الشریعۃ جامعہ سید احمد شہید کٹولی) کی صدارت میں طلبائے مدرسہ سیدنا بلال کا ثقافتی پروگرام ہوا، جس میں ترانہ ندوہ، عربی، اردو تقریر کے ساتھ دلچسپ ورزش اور والی وال گیم کا دلچسپ مظاہرہ کیا گیا، اس پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے کہا: رسوخ فی العلم کیلئے بلندئ ہمت کے ساتھ درسیات کی پختگی بہت ضروری ہے، درسیات میں مہارت اور خارجی مطالعہ کی کثرت کامیابی کی شاہ کلید ہے، موقع ومحل کی مناسبت سے جوش وہوش کا اظہار کلام کو خوبصورت بنادیتا ہے۔

اس مسابقہ میں اول محمد عثمان، (مدرسہ مظہر اسلام بلوچپورہ) اور مدرسہ سیدنا بلال کے محمد توصیف اور شمس تبریز دوم اور سوم آئے، پانچ ہزار چار ہزار اور تین ہزار اور مختلف کتب بطور انعام دیئے گئے، اور ہر مساہم کو تشجیعی انعام سے نوازا گیا، جلسہ کی عربی زبان میں نظامت مولانا مسعود عالم ندوی (استاذ مدرسہ سیدنا بلال) نے کی، امید ہے کہ دیگر مدارس بھی اسی طرح کے علمی وادبی انعامی مقابلے اپنے ہاں منعقد کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: اصلاح معاشرہ کی تعبیر (مولانا علی میاں کے افکار کی روشنی میں)

صفحات : ۳۲

مصنف : ڈاکٹر حافظ فدا حسین

ناشر: معہد امام حسن البناء بھٹکل۔

معہد الامام حسن البناء سے مسلسل مطبوعات شائع ہوتی رہتی ہیں جو فکری رہنمائی، فرد کی اصلاح اور معاشرے کی تعمیر کے لیے انتہائی مفید ہوتی ہیں، پیش نظر رسالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ رسالہ دراصل وہ مقالہ ہے جو حافظ فدا حسین نے ہمارے ادارے میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس بعنوان ''معاصر افکار اور مولانا علی میاں کا موقف- تقابلی مطالعہ'' میں پیش کیا تھا، الحمدللہ یہ عنوان بھی ناچیز راقم کا متعین کردہ تھا، راقم نے یہ اہتمام کیا تھا کہ تعین کے ساتھ مقالہ نگاران سے مقالے لکھوائے جائیں، بحمدللہ سوائے چند کے سارے مقالے اسی ترتیب سے آئے اور وہ مطبوعہ شکل میں اب دستیاب ہیں، یہ مقالہ بھی ۸۸۸ صفحات پر مشتمل مجموعہ مقالات کی زینت ہے، عربی مقالات کا مجموعہ ۱۲۴ صفحات پر مشتمل اس سے علیحدہ ہے۔

یہ سطریں اس لئے لکھنی پڑیں کہ اس کے پیش لفظ میں اصل مصدر کا ذکر نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ ''حکمت قرآن'' نامی رسالہ سے نقل کیا گیا ہے، جو لاہور سے نکلتا ہے، ممکن ہے اسی میں تذکرہ نہ رہا ہو، اصول کی بات یہ تھی کہ صاحب مقالہ اس کی اطلاع دیتے اور پھر شائع کرتے اس لئے کہ اس طرح کے مضامین جو بالخصوص لکھوائے جائیں بہرحال امانت ہوتے ہیں۔

اصلاح معاشرہ ہر زمانہ کی ضرورت رہی ہے، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی بشر کی تہذیب واصلاح کے لئے ہوئی ہے، اس زمانے میں جبکہ جاہلیت جدیدیت اور تجدد کا اپ ٹو ڈیٹ لبادہ اوڑھ کر عود کر آئی ہے، اس کے متعدد مظاہر سے متدین گھرانے، جماعتیں اور شخصیات بھی مبرا نہیں رہ گئے ہیں، ان حالات میں اصلاح کے عمل کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے، فساد کے اسباب کا پتہ لگانا اور ان کا مخلصانہ طور پر صحیح علاج تجویز کرنا اور اس کے لئے عملی کوششیں کرنا وقت کی اولین ضرورت بن گیا ہے، بنی اسرائیل کے زوال کے اسباب میں ایک سبب قرآن مجید نے یہ بھی شمار کرایا ہے کہ ان کے یہاں منکرات کی نکیر کا عمل ختم ہوگیا تھا، ہمارے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس عمل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت حکمت کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے انجام دیا، انہوں نے اصلاح معاشرہ کے عمل کو ایک تحریک بنادیا، امراض کی تشخیص کی، اسباب کا پتہ لگایا، ذہنی کشمکش کی وجوہات کا ادراک کیا، معاشرہ کے اضطرابات کی نشاندہی کی، پھر قرآن سے رہنمائی حاصل کی، احادیث کی تمثیلات سے فائدہ اٹھایا اور معاشرہ میں اصلاح معاشرہ کے نام پر تحریری، تقریری اور دعوتی پیمانے پر ایک طاقتور تحریک ''اصلاح معاشرہ'' شروع کی۔

حافظ فدا حسین صاحب نے موضوع کا اچھی طرح احاطہ کیا ہے، حضرت مولاناؒ کی تحریروں میں اصلاح معاشرہ کی تعبیر کسی طرح استعمال کی گئی ہے، اس کا کیا مفہوم ہے، اس سے کس طرح کام لیا گیا ہے، اس طرح حضرت مولانا کی تحریروں اور خطبات سے مستفاد یہ مضمون اصلاح معاشرہ کے لئے شاہ کلید کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ اس میں وجوہات واسباب اور امراض وعلاج اور اصلاح کے اصولوں کی وضاحت ہوگئی ہے، اس رسالہ پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی زید مجدہم کا مقدمہ ہے۔ ناشر و مضمون نگار دونوں ہی شکریہ کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

نوٹ: مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ پر بین الاقوامی کانفرنس کے مجموعے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ذیل میں دونوں جلدوں کی فہرست قارئین کی نذر کی جارہی ہے، فہرست دیکھنے کے بعد شاید قارئین کے لئے دونوں جلدوں میں دلچسپی کا سامان ہو:

فہرست جلد اول:

المحور الأول:-موقف الشيخ الندوى من عرض الدعوة الإسلامية ونقد الحضارات.

١۔ كلمة المنسق — د. محمد طارق الأيوبى الندوى
٢۔ شيخ الدعاة — الأستاذ أبو رياش
٣۔ الشيخ أبوالحسن الندوي حكيم الوسطية — أ۔ د. حسن الأمرانى
٤۔ موقف الندوة من عرض الدعوة الإسلامية — د. سراج الدين الإسرع بن بلال
٥۔ الحكمة وخصائصها فى الخطاب الدعوة للشيخ أبي الحسن الندوي — د. محمد مراح
٦۔ بحث اختيارات الشيخ الندوي للآيات القرآنية ا لمتعلقة بالأفكار المعاصرة — د۔ عصام بن عبدالمحسن الحميدان
٧۔ نظرة الإمام الندوي إلى الحضارة الغربية وتاريخها — د. برزان ميسر الحامد
٨۔ فلسفة التاريخ والحضارة عند الإمام الندوي — أ۔د. أحمد إسماعيل عبدالله الجبور
٩۔ موقف العلامة أبى الحسن الندوى من واقع المسلمين ومنهجه فى التجديد والإصلاح — د. مسعود بودوخة
١٠۔ نظرية الإصلاح فى فكر الشيخ أبي الحسن الندوي — أ۔د. باسل خلف حمود
١١۔ التوجيه العقدة فى فكر الشيخ الندوي وأثره فى تحصين الأجيال — د. بشار شعلان عمر النعيم
١٢۔ عالم الخطاب الديني عند الإمام أبي الحسن الندوي — الأستاذ عبدالسلام حمود غالب الأنسى
١٣۔ البعد الأخلاقى فى فكر الشيخ أبى الحسن الندوي — د. الجمع الشبايكى
١٤۔ أبوالحسن علي الحسني الندوي ومنهجه فى التفكير و الإصلاح — أ۔د. عبد الوهاب فرحات
١٥۔ رحلة أبي الحسن الندوي إلى اليمن وتحليل أفكاره — الأستاذ عبدالوهاب صالح التويت
١٦۔ الإسلام فى القارة الإفريقية فى كتابات الشيخ أبي الحسن الندوي — د. بشار اكرم جميل الملاح
١٧۔ رحلا ت العلامة أبي الحسن الندوي بين العلم والتاريخ — أ۔د. مصطفى أبو سليمان الندوي
١٨۔ موقف العلامة أبي الحسن الندوى فى عرض الدعوة الإسلامية من الوسطية والاعتدال — أ۔د. تقي الدين الندوي
١٩۔ موقف العلامة الإمام أبي الحسن علي الحسني الندوي نحو الحضارة الغربية — د. سعيد الرحمن فيضي الندوي

المحور الثانى:- موقف الشيخ الندوي من السياسة المعاصرة والعالم الإسلامى

٢٠- الصحوة الإسلامية فى فكر الإمام الندوي الأستاذ محمود القاعود

٢١- أثر التجربة التاريخية الإسلامية فى الآراء السياسية للشيخ أبي الحسن الندوي

أ.م.د. محمد خالد عبد البرهاوي

٢٢- موقف الشيخ الندوي من قيادة العالم الإسلامي .عبدالله طه،عبدالله ناصر السلمانى

٢٣- قيادة العرب للعالم الإسلامي فى طروحات أبي الحسن علي الحسني الندوي

أ.د. عونى عبدالرحمن السبعاوى

٢٤- العلامة أبو الحسن الندوي ورؤيته للهوية الإسلامية الأستاذ علاء عبدالرزاق

٢٥- فكر العلامة أبو الحسن الندوي من خلال كتابه ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين

د. ياسر عبد الجواد المشهدان

٢٦- رؤية الشيخ الندوي لأسباب تدهور أوضاع العالم الإسلامي أ.د. محمد عمر أحمد الشاهين

٢٧- قراءة الإمام الندوي للحياة الدينية فى الهند د. سفيان ياسين إبراهيم

المحور الثالث:- موقف الشيخ الندوي من الأدب والتعليم والتزكية

٢٨- حقيقة التصوف الإسلامي عند أبي الحسن الندوي من تحرير النفس إلى بناء المجتمع

د. صالح نعمان

٢٩- منهج الشيخ أبي الحسن الندوي فى السيرة الذاتية أ.د. حلمي محمد القاعود

٣٠- قواعد التزكية من خلال فكر الأستاذ الندوي (قراء فى ربانية لا رهبانية) د. رمضان حمدون علي رمو

٣١- أهمية المكان فى إثراء التوهج الروحة فى ترجمة الشيخ الندوي "لروائع إقبال" د. سعد أبو الرضا

٣٢- أساليب اللغة العربية وطرائق تعليمها عند الشيخ الندوي د. بن عيسى بطاهر

٣٣- نظرية الأدب الإسلامى فى فكر أبى الحسن الندوي د. محمد سالم سعدالله

٣٤- الأدب الإسلامي بين الندوي وباكثير د. عبدالحكيم الزبيد

٣٥- منهج أبي الحسن الندوي فى أدب الطفل أ.د. عبدالملك بو منجل

٣٦- منهج الشيخ الندوي فى كتابه "أدب السيرة النبوية للأطفال" د. صادق محمد أدم سليمان

٣٧- منهج أبى الحسن الندوي فى أدب الأطفال الأستاذ محمد عبدالكريم ياسين العراقي

٣٨- وقفات مع ركائز أدب الأطفال لدى أبى الحسن الندوي فى كتابه قصص من التاريخ الإسلامة للأطفالد.

عبدالغني أكوريدي عبد الحميد

٣٩- نماذج من ثمار الندوي فى عالمية الأدب والفكر، نظرات فى شعر جابر قميحة و حسن الأمراني

أ.د. حامد صادق قنيبي

☆☆☆

فہرست جلد دوم

۱۔ مختصر روداد کانفرنس ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

۲۔ کانفرنس کے اغراض ومقاصد

۳۔ تجاویز

۴۔ مقدمہ ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

۵۔ خطبۂ افتتاحیہ ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

۶۔ خطبۂ استقبالیہ: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی

۷۔ خطبۂ صدارت: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

۸۔ عربی قصیدہ ابوریاش / ترجمہ: محمد پاشا ندوی

پیغامات

۹۔ علامہ یوسف القرضاوی

۱۰۔ پروفیسر طارق رمضان

۱۱۔ شیخ محمد زاہد بن شیخ عبدالفتاح ابوغدہ

۱۲۔ پروفیسر سید سلمان ندوی

۱۳۔ جناب رضا مرادی

۱۴۔ مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی

۱۵۔ السید یوسف الرفاعی

۱۶۔ الشیخ احمد عباد

تأثرات

۱۷۔ النظام والکرم فی المؤتمر الدولی أ۔د۔سعد ابوالر

۱۸۔ رحلۃ الھند أسبوع من التحلیق د۔عبدالملک بومنجل

مغربی تہذیب اور جدید فکری، سیاسی، وعالمی مسائل میں مولانا کا موقف

۱۹۔ معاصر مسائل وقضایا میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا معتدل موقف مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

۲۰۔ عالم عربی کی صورت حال اور اس کا علاج مولانا علی میاں کی تحریروں کی روشنی میں مولانا سید سلمان الحسینی ندوی

۲۱۔ مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور ہندوستانی سیاست مولانا جمال عارف ندوی

۲۲۔ ملت اسلامیۂ ہند کی سیاسی ضروریات اور مولانا علی میاں ندویؒ ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

۲۳۔ عصر حاضر میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے افکار کی معنویت ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی

۲۴۔ تحریک شہیدین اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی

۲۵۔	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور مغربی تہذیب کے تئیں آپ کا موقف	ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی
۲۶۔	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی
۲۷۔	اسلام اور مغرب کی معرکہ آرائی اور مولانا علی میاں	ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی
۲۸۔	اصلاحِ معاشرہ کی تعبیر (مولانا علی میاں کے افکار کی روشنی میں)	ڈاکٹر حافظ فدا حسین
۲۹۔	عالم عربی کا المیہ اور مفکر اسلام کا موقف	مولانا جمال احمد ندوی
۳۰۔	مغرب اور اسلام (مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے افکار کا مطالعہ)	ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی
۳۱۔	''قومیت عربیہ'' کا طوفان اور مفکر اسلام کی غیرت ایمانی اور دور اندیشی	مولانا محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری
۳۲۔	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مغربی افکار و نظریات	مفتی رحمت اللہ ندوی
۳۳۔	مسلمانان عالم کے بعض اہم مسائل اور ان کا حل مولانا علی میاں ندوی کے انٹرویوز کی روشنی میں	عبدالہادی اعظمی ندوی
	مفکر اسلام اپنے اسلوب و منہج اور علمی و دعوتی خصوصیات کے آئینہ میں	
۳۵۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی طریقہ کار اور منہج فکر	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
۳۶۔	حضرت علی میاں کا ذوقِ شعر و سخن	پروفیسر ظفر احمد صدیقی
۳۷۔	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اسلوب کی ادبیت	مولانا عمیر الصدیق ندوی
۳۸۔	تحریک پیام انسانیت اور مولانا علی میاںؒ کی کوششیں	جناب انیس چشتی
۳۹۔	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور انسانی فلاح و بہبود کی کوششیں	مولانا محمد کمال اختر ندوی
۴۰۔	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تنقیدی اسلوب	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
۴۱۔	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے عربی خطبات (فکر و فن کا جائزہ)	پروفیسر محمد سمیع اختر فلاحی
۴۲۔	تقاریر ندویؒ میں قرآنیات	پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
۴۳۔	مولانا علی میاں کی حب الوطنی	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی
۴۴۔	قرآن حکیم اور حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمۃ	قاری محمد قاسم انصاریؒ
۴۵۔	حضرت مولانا سید علی میاں ندویؒ کی علمی خدمات	مفتی احمد دیولا
۴۶۔	عشقِ رسول کی جہاں گیری مولانا علی میاں ندویؒ کی تحریروں کے آئینہ میں	آفتاب عالم ندوی
۴۷۔	مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک عظیم سیرت نگار	ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
۴۸۔	علامۂ ہند: سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ عرب و عجم کی نظر میں	محمد عبدالرشید ندوی
۴۹۔	علامہ اقبال اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکری ہم آہنگی	ڈاکٹر سفیان حسان ندوی
۵۰۔	حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور مردم سازی	محمد مجتبیٰ قاسمی
۵۱۔	بے آب و گیاہ سرزمین راجستھان کے نخلستان ٹونک میں فکر ابوالحسن	مفتی محمد عادل خان ندوی
	نصاب تعلیم اور مراکز تعلیم کے سلسلہ میں مولانا کی آراء و افکار	
۵۲۔	علامہ ابوالحسن کے اعلیٰ تعلیمی نظریات (نصاب تعلیم کا تجزیہ اور امت اسلامیہ)	پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

۵۳۔ عصری جامعات کے طلبہ کی فکری تربیت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا موقف — جناب عتیق الرحمٰن

۵۴۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار و آراء (یونیورسٹیوں میں کی گئی تقریروں کے حوالے سے) — ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

۵۵۔ تعلیم نسواں۔مولانا علی میاں ندویؒ کی نظر میں — مفتی محمد عارف باللہ القاسمی

۵۶۔ نصابِ تعلیم اور حضرت مولاناؒ کا موقف — مولانا ساجد خان ملی ندوی

۵۷۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ادبِ اطفال — مولانا محمد قمر الزماں ندوی

۵۸۔ معاشرے کی تشکیل میں مدارس اور عصری جامعات کا رول — مولانا نعیم الرحمٰن ملی ندوی

۵۹۔ تحفظ عقیدہ کے تئیں حضرت مولانا کی فکر — مولانا جمال ناصر ندوی

۶۰۔ سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ اور ازہرِ ہند دیوبند — ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی

۶۱۔ ہندوستان کے مدارس میں صرف ونحو کی تدریس اور تجدید نصاب کی ضرورت مفکر اسلام کی فکر کی روشنی میں — مولانا شاہد حسین ندوی

۶۲۔ موقف العلامۃ الندوی فی نقد الحضارۃ الغربیۃ — الأستاذ محمد علاء الدین الندوی

عربی مقالات

٦٣۔ موقف الشيخ الندوى من النظام التعليمى في المدارس والجامعات — الأستاذ شاكر فرخ الندوي۔

٦٤۔ أفضل منهج للتجديد والاصلاح فى رأى الشيخ أبى الحسن على الحسنى الندوى — الأستاذ سلمان نسيم الندوي

٦٥۔ موقف العلامة الندوى من الصحوة الإسلامية ودوره فيها — محمد غياث الإسلام الصديقى الندوى

٦٦۔ موقف الدعوة فى ضوء كتاب رجال الفكر والدعوة — محمد ريحان خان ندوى

٦٧۔ الصراع الفكرى الجارى فى العالم العربى فى ضوء آراء أبى الحسن الندوى — الدكتور عبدالماجد نديم

٦٨۔ الإمام الندوى ومميزاته عند الشيخ القرضاوى — الدكتور محسن عثمانى الندوى

٦٩۔ أبو الحسن الندوى: عميد الأدب الإسلامى — الدكتور شفيق أحمد خان الندوى

٧٠۔ موقف الشيخ الندوى من فن التراجم فى ضوء مؤلفاته — د۔ محمد نجم الحق الندوى

٧١۔ التفسير السياسى للمودودى حول الإله والرب والعبادة والدين دراسة تحليلة على ضوء آراء الشيخ الندوى — الدكتور محمد شهيد الإسلام

٧٢۔ إطلاعات العلامة الندوى على الأمة العربية — وضاح محمد طالب مجور

انگریزی مقالات

A Great Reformer of..... — **Ayub Sufi Hasan**

Sheikh Ali Miyan A..... — **Dr. Sarfaraz Alam**

Sheikh Abul Hasan His Vision, Mission and Contributions. M. Shujaath Ali Nadwi

☆☆☆

زبان وادب

وصیت نامہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

منظوم ترجمانی: بقلم رئیس احمد نعمانی

وصية الشيخ السيد عبدالقادر الجيلانى رحمه الله

لمامرض مرضه الذى مات فيه قال له إبنه عبدالوهاب أوصنى بما أعمل به بعدک فقال:

☆ عليک بتقوى الله. **☆ ولا تخف احدا سوى الله.**

☆ ولا ترج احدا سوى الله. **☆ وكِلِّ الحوائجَ إلى الله.**

☆ ولا تعتمد إلا إليه. **☆ واطلُبها جميعا منه.**

☆ ولا تَثِق باحد غيرَ الله. **☆ التوحيد.**

☆ التوحيد إجماع الكل. (تكملة فتوح الغيب)

(۱)

شیخ عبدالقادر جیلانی مردِ خدا
عالمانِ دین میں تھا جن کا اونچا مرتبہ
عمر بھر جن کا عمل توحید و تقویٰ پر رہا
درس دیتے تھے زمانے بھر کو جو توحید کا

(۲)

جادۂ توحید سے ہرگز نہ بھٹکے جو کبھی
شرک و بدعت سے ہمیشہ ہی جنہیں نفرت رہی
جو نمونے کے لیے رکھتے تھے ہر دم، ہر گھڑی
سامنے نظروں کے بس سنت رسولؐ پاک کی

(۳)

ان کے جب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا
اور مرض میں موت کے جب ہو گئے وہ مبتلا
موت جس کے سامنے، بے بس ہے ہر چھوٹا بڑا
جس سے بچ جانا مقدر انبیاءؑ کا بھی نہ تھا

(۴)

پاس آئے ان کے اس دم، ان کے فرزند کبیر
اور زبان پر لائے اپنی وہ یہ حرفِ دل پذیر
بولے: اے شیخِ زمانہ، مؤمن صادق ضمیر
اہل ایماں کے لیے ہے جس کی سیرت اک نظیر

(۵)

کیجئے ایسی وصیت آپ مجھ کو اس گھڑی
مسکن دنیا سے جب ہوجائے رحلت آپ کی
میں بناؤں اس کو دستورِ عمل تا زندگی
ہو منور جس سے دنیا اور عقبی بھی مری

(۶)

وہ ولی حق یہ سن کر اس طرح گویا ہوئے:
اے مرے نورِ نظر اے مضطرب بیٹے مرے
جب تلک بھی زندہ دنیا میں خدا رکھے تجھے
دامنِ تقویٰ کبھی چھوٹے نہ تیرے ہاتھ سے

(۷)

تجھ کو لازم ہے ڈرے اللہ سے تو سدا
ہو ترے دل میں کبھی ہرگز نہ خوفِ ماسِوا
ہو اسی کی ذات مرکز تیری ہر امید کا
غیر پر اس کے کبھی رکھنا نہ اپنا آسرا

(۸)

اپنے مرکز سے نہ ہٹنے دے دلِ آگاہ کو
چھوڑنا ہرگز کسی لمحے نہ حق کی راہ کو
حق کی رحمت سے مدد ملتی ہے ہر حق خواہ کو
حاجتیں ساری بس اپنی سونپ دے اللہ کو

(۹)

دل میں رکھتا ہو کوئی تجھ سے محبت یا عناد
اہلِ دنیا کی طبیعت میں ہے مضمر ایک فساد
سب سہاروں کو، سوائے اس کے، کہہ کر خیر باد
رکھ خدائے پاک ہی پر ہر دم اپنا اعتماد

(۱۰)

ساری دنیا کا ہے خالق اور مالک اک خدا
دے نہیں سکتا کسی کو، کوئی کچھ، اس کے سوا
اس یقیں کے ساتھ، اے فرزندِ باصدق وصفا
سب مرادیں اپنی، بس اللہ ہی سے مانگنا

(۱۱)

اور سوائے ذاتِ باری کے، کسی کی ذات پر
بھول کر بھی تو نہ کرنا کچھ بھروسا اے پسر
دور رکھ غیرِ خدا سے اپنا دل، اپنی نظر
ان کی ہستی، اور سبھی کچھ ان کا ہے نا معتبر

(۱۲)

حرفِ آخر ہے اے جو یائے رشد و آگہی
ہے یہی متن، اور یہی شرحِ کتاب زندگی
حاصلِ ایماں ہے، بنیادِ ولایت ہے یہی
ہو یقیں پختہ ترا، توحید پر اللہ کی

(۱۳)

نقش راسخ ہو، ترے دل میں فقط توحید کا
کیوں کہ ہے توحید ہی وہ نکتۂ وصفِ خدا
متفق جس پر ہمیشہ سے ہیں سب اہلِ ذکا
سب کتابیں آسمانی اور سارے انبیاء

☆☆☆

آخری صفحہ

میں اللہ کو کیا جواب دوں گا

م۔ق۔ن

مدارس اسلامیہ کے قدیم اساتذہ کا سب سے بڑا امتیاز اور ان کا شعار اخلاص وایثار تھا، چونکہ تعلیم وتعلم کا اخروی ثواب ارو استاذ ومعلم کی دینی فضیلت ان کے ذہن پر نقش تھی، ان کے عقیدہ کا حصہ اور جزو ایمان بن چکی تھی، اس لئے ان میں اگر سب نہیں تو بڑی تعداد محض رضائے الٰہی اور حصولِ اجر وثواب کے لئے تعلیم وتعلم میں مشغول تھی۔ اور اس کو افضل عبادت اور اعلیٰ سعادت سمجھتی تھی۔

ان اساتذۂ کبار کے زہد وایثار اور فقر واستغناء کے بڑے مؤثر اور لدوز واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، اس آخری کالم میں صرف ایک واقعہ بطور عبرت نقل کیا جاتا ہے۔

''مولانا عبدالرحیم صاحب (م۱۲۳۴ھ) رام پور میں درس دیتے تھے، روہیل کھنڈ کے انگریز حاکم مسٹر پاکنس نے ان کو بریلی کالج کی تدریس کے لئے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ کی (اس زمانے کے اعتبار سے کثیر رقم) پیش کش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس مشاہرہ (تنخواہ) میں اضافہ اور ترقی ہوجائے گی، انہوں نے عذر کیا کہ ریاست سے ان کو دس روپیے ماہوار ملتے ہیں وہ بند ہوجائیں گے، اس کے مقابلے میں اس حقیر رقم کی کیا حیثیت ہے؟ انہوں نے عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے اس کی بیری بہت میٹھی اور مجھے مرغوب ہے، بریلی میں وہ بیری کھانے کو نہیں ملے گی، ظاہر میں انگریز اب بھی ان کے دل کی بات نہیں پا سکا، اس نے کہا رام پور سے آنے کا انتظام ہوسکتا ہے، آپ بریلی میں گھر بیٹھے اپنے درخت کی بیری کھا سکتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رام پور میں درس لیتے ہیں ان کا درس بند ہوجائے گا، اور میں ان کی خدمت سے محروم ہوجاؤں گا، انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی، اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں وہ بریلی میں آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں۔ آخر اس مسلمان عالم نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے لیکن تعلیم پر اجرت لینے کے متعلق میں قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ (تاریخ اودھ)

یہ واقعہ اگر چہ اپنی نوعیت میں نرالا اور غیر معمولی ہے، اس میں اساتذہ کے لئے درس عبرت بھی ہے اور اخلاقی تربیت کا سامان بھی، مگر ہندوستان کی تعلیمی ودینی تاریخ میں اساتذہ کے اخلاص وایثار زہد وقناعت اور فقر واستغنا کے ایسے بہت سے واقعات درج ہیں جو مدارسِ اسلامیہ کے نظام تعلیم وتربیت کا ایک حصہ اور روایت بن گئے ہیں، آج کے اس دور مادیت میں اساتذۂ مدارس اسلامیہ کی زندگی اکثر خواہی نہ خواہی قناعت و استغنا کے ساتھ ہی گزرتی ہے، ذرا غبار اگر ان شاندار روایات پر چڑھ گیا ہے تو اسلاف کے ان واقعات کی مدد سے اسے صاف کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ نمبر ۷۶ کا <<< مگر ہم اس کے لئے کچھ کرنے کی کوشش نہیں کرتے، ہمیں صرف اور صرف ایک منظم، پختہ اور سنجیدہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، بے حسوں کی حس بیدار کرنی ہے، خوابیدہ صلاحیتوں کو برائے کار لانا ہے ار زیادہ نہیں بس تھوڑی تھوڑی اور چھوٹی چھوٹی کاوشوں سے ایک ایسا نظام بنانا ہے جس کے تحت ہم اسلامی دعوت کو ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے منتظر ہیں۔

اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کا ذکر کرنا تو خیر زیادتی ہوگی، خواص کا حال بھی جو علماء، ادباء، حضرات، داڑھی کرتا پاجامے میں ملبوس دین کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں ان کا حال بھی کچھ خوش کن نہیں ہے، ہر جگہ مستثنیات ضرور ہوتے ہیں یہاں بھی ہوں گے اور ہیں مگر للاً کثر حکم الکل کے تحت عمومی حال بہت بدتر ہے، خود کو بھی اور قوم کو بھی دین اور ترویج دین کے نام پر دھوکہ دیا جارہا ہے، مصلحین امت کے جامہ میں ملبوس حضرات بظاہر کس طرح دنیاداری اور دنیا پرستی میں مبتلا ہیں اس کو بیان کرنا بے معنیٰ ہے، تحریر لکھتے وقت جب خود پر بلا واسطہ نظر پڑی تو شرم کے سوا کچھ نہ ملا کہ اس تحریر میں جب ایک انگلی دوسروں کے کردار اور افعال پر اٹھی تو باقی تین انگلیاں ادھر بھی آئینہ دکھاتی نظر آئیں، ہم سب کا حال اللہ معاف کرے، زیادہ اچھا نہیں ہے، یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے اور ایک حساس مسئلہ ہے، جتنی جلدی ہم اپنی خامیوں پر قدغن لگا سکیں یہ ہمارے مستقبل کے لئے مناسب ہوگا، ساتھ ہی دوسروں کے لئے دل میں ، وہی تڑپ وہی درد اور وہی جذبہ پھر جگانا ہوگا جو انبیائے سابقین نے ہمیں سکھایا اور جس وجہ سے ان کی بعثت ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ بس معاف فرمائے اور ہم سب سے دین کا صحیح کام لے لے، آمین و باللہ التوفیق۔

☆☆☆

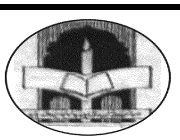

جامعۃ البنات حیدرآباد

JAMIATUL BANATH HYDERABAD

شعبہ حفظ عالمیت، فضیلت

لڑکیوں کا اعلیٰ و معیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ

شہر کے اہم مقامات سے بسوں کی سہولت

دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی و کمپوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔
عثمانیہ یونیورسٹی (اورینٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔
ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبۂ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔
(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)

والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔

نوٹ: (۱) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اور کوئی شاخ نہیں ہے۔

JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)

صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:

پتہ: جیون یار جنگ کالونی، روبرو مدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی، سعید آباد، حیدرآباد۔
رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534
Website:www.jamiatulbanath.org